وَمَن يُؤتَ الحِكمَةَ فَقَد أُوتِيَ خَيرًا كَثِيرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمت قرآن

لاہور

مدیر مسئول :

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن۔لاہور ۱۴

زر سالانہ ۲۰ روپے

اس شمارے کی قیمت ۴/=

ماهنامہ
حکمتِ قرآن
لاھور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدّین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

شمارہ ۵، ۶	جولائی، اگست ۱۹۸۲ء	جلد: ۱

تقدیم

حسبِ اعلان 'حکمتِ قرآن' کی اس دو ماہی اشاعت میں

"دعوتِ رجوع اِلیٰ القرآن کا منظر و پس منظر"

کے عنوان سے برادرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی چند تحریریں یکجا شائع کی جا رہی ہیں جو 'ماہنامہ میثاق' میں ۷۶ء، ۱۹۷۵ء کے دوران وقتاً فوقتاً شائع ہوتی تھیں ——— ان کو پڑھتے ہوئے یہ امر پیشِ نظر رہے کہ انہیں من وعن جوں کا توں شائع کیا جا رہا ہے چنانچہ بعض حضرات جن کا ان میں ذکر ہے ۷۶ء، ۱۹۷۵ء میں بقیدِ حیات تھے لہٰذا ان کا ذکر اسی انداز میں آیا ہے، اگرچہ اب وہ مرحومین و مغفورین کی فہرست میں شامل ہو چکے ہیں۔ وَقِس علیٰ ذالک،

خاکسار (ڈاکٹر) ابصار احمد

ناشر: ڈاکٹر اسرار احمد طابع: مطبع: آفتاب عالم پریس

Meptine Tablets
تین گولی روز صرف تین روز

دعوت
رجوع اِلی القرآن
کا منظر و پس منظر

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ترتیب

★

قرآن، قرنِ اوّل میں اور اُس کے بعد

صفحہ ——— ۳

★

اِسلام برّصغیر پاک و ہند میں

صفحہ ——— ۱۱

★

تحریکِ رجوع اِلی القرآن

صفحہ ——— ۲۷

★

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

کا مؤسس اور اُس کے فکری رشتے

صفحہ ——— ۴۷

★

ضمیمہ :

شاہ ولی اللہ دہلوی کی قرآنی خدمات

صفحہ ——— ۷۶

قرآن حکیم

قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد

بدءِ اسلام میں اسلام کی دو عظیم ترین حقیقتیں:

قرآن حکیم اور جہاد فی سبیل اللہ

قرآن منبع و سرچشمۂ ایمان و یقین

اور جہاد ایمانِ حقیقی کا مظہرِ اتم

(ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ"، ماہنامہ "میثاق"، لاہور بابت دسمبر ۷۵ء)

واقعہ یہ ہے کہ 'بدءِ الاسلام' میں دین کی اصل اساسی اور بنیادی حقیقتیں دو ہی تھیں ـــــ ایک قرآنِ حکیم جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدّوجہد کے ضمن میں 'آلۂ انقلاب' کی حیثیت حاصل ہے بقول مولانا حالی ؎

اُتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع عنوان ہے آپؐ کی اِس جِدّ و جُہد کے مختلف مدارج و مراحل کا۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن مجید ہی کی گرج اور کڑک تھی جس نے نیند کے ماتوں کو جگایا اور خوابِ خرگوش کے مزے لوٹنے والوں کو بیدار کیا۔ چنانچہ "وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝" اور "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝" کی چونکا دینے والی صدائیں اور "اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝" اور "اَلْحَاقَّةُ ۝ مَا الْحَاقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاقَّةُ ۝" کی بیدار کن ندائیں ہی تھیں جنہوں نے پورے عرب میں ہلچل مچادی اور "عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ الَّذِیْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝" کی کیفیت پیدا کردی۔ بقول مولانا حالیؔ ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادیؐ عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی

پھر —— اسی کی آیات بیّنات تھیں جنہوں نے هُوَ الَّذِیْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۝ (الحدید :۹) کے مصداق انسانوں کو شرک، الحاد، مادّہ پرستی، حُبِّ عاجلہ، اور حیوانیتِ محضہ کے "ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" ایسے مہیب اور ہولناک اندھیروں سے نکال کر ایمان اور یقین کی روشنی سے بہرہ ور فرمایا۔ چنانچہ وہ ایک طرف عرفانِ الٰہی اور محبّتِ خداوندی سے سرشار یعنی مستِ بادۂ الست ہوگئے اور دوسری طرف دنیا و مافیہا ان کی نگاہوں میں مچھّر کے پَر سے بھی حقیر تر ہوگئے اور وہ کُلّیۃً طالبِ عقبیٰ بن گئے۔

مزید برآں —— وہی تھا جو "مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ" بھی بن کر آیا، اور "شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ" بھی [illegible] کے ذریعے لوگوں کا تزکیۂ نفس بھی ہوا اور تصفیۂ قلب و تجلیۂ روح بھی۔

گویا انذار ہو یا تبشیر [illegible] تعلیم ہو یا تربیت
تزکیہ ہو یا تصفیہ، تجلیہ ہو یا تنویر —— [illegible] محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کا پُورا عملِ دعوت و اصلاح قرآن مجید ہی کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایک نہ دو پورے چار مقامات پر آنحضورؐ کے منہج انقلاب کو جن اساسی اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے اُن کا اوّل و آخر خود قرآن مجید ہی ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی :

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ — سناتا ہے انہیں اُس کی آیات اور پاک
يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ — کرتا ہے ان کو اور سکھاتا ہے انہیں
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ: ۲) — کتاب اور حکمت !

قرآن کا کارنامہ، ایک جملے میں بیان کیجیے، تو یہ ہے کہ اس نے صحابۂ کرام رضوانُ اللہ تعالیٰ اجمعین کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیا اور توحید، معاد اور رسالت پر یقینِ محکم کی کیفیت پیدا کر دی۔ لیکن اِس سے اُس ہمہ گیر تبدیلی کا اندازہ نہیں ہوتا جو قرآن حکیم کے بدولت اُن کی زندگیوں میں برپا ہو گئی تھی اس لیے کہ قرآن نے اُنؓ کا فکر بدلا، سوچ بدلی، نقطۂ نظر بدلا، اقدار بدلیں، عزائم بدلے، اُمنگیں بدلیں، شوق بدلے، دلچسپیاں بدلیں، خوف بدلے، اُمّیدیں بدلیں، اخلاق بدلے، کردار بدلے، خلوت بدلی، جلوت بدلی، انفرادیت بدلی، اجتماعیت بدلی، دن بدلا، رات بدلی حتّٰی کہ "تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ" کے مصداق آسمان بدلا، زمین بدلی، الغرض پُوری کائنات بدل کر رکھ دی ——— اور اِس پوری تبدیلی کا ذریعہ اور آلہ ہیں قرآنِ حکیم کی آیات بیّنات : بقول علامہ اقبالؒ :

بندۂ مومن زِ آیاتِ خداست — ایں جہاں اندر برِ او چوں قباست !
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دہد قرآں جہانِ دیگرش !

تبدیلی اگر حقیقی اور واقعی ہو تو اُس کی کوکھ سے لازماً تصادم اور کشمکش جنم لیتے ہیں جن کے مراحل تبدیلی کی نوعیّت اور مقدار کی نسبت سے کم و بیش ہو سکتے ہیں۔ ایمان نے جو تبدیلی صحابۂ کرامؓ میں پیدا کی اُس نے جس تصادم اور کشمکش کو جنم دیا اُس کے جملہ مدارج و مراحل کا جامع عنوان ہے "جہاد فی سبیل اللہ"۔

اِس تصادُم اور کشمکش کا اوّلین ظہور انسانوں کی اپنی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ 'مجاہدہ مع النفس' کو 'افضل الجہاد' قرار دیا گیاؔ۔ پھر جب ایمان اشخاص کے باطن میں اس طرح راسخ اور مستولی ہو گیا کہ ریب اور تشکک کے کانٹے نکل گئے تو اب اُسی جہاد و مجاہدہ کا ظہور عالمِ خارجی میں ظالموں سرکشوں اور خُدا کے باغیوں سے کشمکش اور تصادُم کی صورت میں ہوا جس کا مقصد قرار پایا 'تکبیرِ ربؔ'، یعنی اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اقرار و اعلان اور اس کی حاکمیتِ مطلقہ کا بالفعل قیام و نفاذ تاکہ "اُس کی مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہوؔ!" ——— اور اس کی آخری منزل ہے "قتال فی سبیل اللہ"، جس کا منتہائے مقصود مُعیّن ہُوا اِن الفاظ میں کہ :

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ	اور جنگ کرتے رہو اُن سے یہاں تک کہ
فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ	"فتنہ" بالکل فرو ہو جائے اور اطاعت
كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال : ۳۹)	کُلّیۃً اللہ ہی کی ہونے لگے !

ایمان و یقین اور جہاد و قتال کا یہی وہ لزومِ باہمی ہے جس کو نہایت واضح اور واشگاف الفاظ میں بیان کیا گیا قرآنِ حکیم کی اس آیۂ مبارکہ میں :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا	اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر پھر شک میں
وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ	نہ پڑے اور جہاد کرتے رہے اللہ کی راہ
اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ	میں اور کھپاتے رہے اس میں اپنے اموال

۱ؔ آنحضورؐ سے دریافت کیا گیا : "اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ؟" تو آپؐ نے ارشاد فرمایا : "اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ !"

۲ؔ الفاظِ قرآنی کی رُو سے "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝" (المدثّر : ۳) اور بقول علامہ اقبالؒ

یا وُسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ خدامست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات!

۳ؔ سیّدنا مسیح علیہ السّلام کے الفاظ۔

هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (الحجرات: ۱۵) اور اپنی جانیں۔ حقیقت میں یہی ہیں سچے!

واضح رہے کہ اِس آیۂ مُبارکہ کے اوّل و آخر حصر کا اسلوب بھی ہے اور آیۂ ماقبل میں 'حقیقی ایمان' اور 'قانونی اسلام' کے مابین فرق و امتیاز کا مضمون بھی۔ گویا مومنِ صادق کی جامع و مانع تعریف قرآن حکیم کی کسی ایک آیت میں مطلوب ہو تو وہ یہی آیت ہے۔

الغرض قرآن کے اصل حاصل ہیں ایمان اور یقین اور اُن کا لازمی نتیجہ ہیں' جہاد اور قتال۔ اِن میں سے ایمان و یقین اصلاً ایک معنوی حقیقت اور داخلی کیفیت کا نام ہیں، چنانچہ عالمِ خارجی میں اسلام کی دو عظیم ترین اور نمایاں ترین' حقیقتیں ہیں قرآن اور جہاد۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں ایمانِ حقیقی کی مستقل علامتوں (SYMBOLS) کی حیثیت رکھتے ہیں اور مردِ مومن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ تخیل اور تصوّر میں اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لازمی و لابُدی ہیں!

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ اور خلافتِ راشدہ کے دوران اسلام کی 'نشأۃِ اُولیٰ' یا غلبۂ دینِ حق کا دَورِ اوّل بلا شائبۂ ریب و شک نتیجہ تھا صحابۂ کرامؓ کے تعلّقِ قرآن اور جذبۂ جہاد کا ——— لیکن یہ بھی ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ جیسے ہی اسلام نے ایک مملکت اور سلطنت کی صورت اختیار کی اِن دونوں کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی۔ اور ایسا ہونا ایک حد تک منطقی اور فطری بھی تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف تو کسی مملکت یا سلطنت میں اوّلین و اہم ترین مسئلہ شہریّت کا ہوتا ہے جو ایک خالص قانونی مسئلہ ہے جس میں تمام تر بحث انسان کے 'ظاہر' سے ہوتی ہے، باطن سے کوئی سروکار ہی نہیں ہوتا گویا بقول علّامہ اقبال ع "بندوں کو گِنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا!" ——— مزید برآں اس کا اصل موضوع نظم و نسق اور امن و امان کا ہوتا ہے جس کے اعتبار سے بنیادی اہمیت قانون اور ضابطے کو حاصل ہوتی ہے نہ مکارمِ اخلاق یا مواعظِ حسنہ کو۔ حتّٰی کہ اس

عتبار سے خصاص عوید مقدم ہوجاتا ہے ——— اور دوسری طرف سلطنتوں اور مملکتوں کو، خواہ وہ اصولی اور نظریاتی ہی ہوں اصل سروکار اپنی حفاظت و مدافعت سے ہوتا ہے، اصولوں اور نظریات کی تبلیغ واشاعت ہوتی بھی ہے تو ثانوی درجے میں اور حکومتوں کی مصلحتوں کے تابع رہ کر!

یہی وجہ ہے کہ جب اسلام مملکت اور سلطنت کے دور میں داخل ہوا تو اصل زور (EMPHASIS) ایمان کے بجائے اسلام پر، یقین کے بجائے قرار اور شہادت پر اور باطن سے بڑھ کر ظاہر پر ہوگیا نتیجۃً قرآن حکیم کے بھی منبع ایمان اور سرچشمۂ یقین ہونے کی حیثیت مؤثر اور نگاہوں سے اوجھل ہوتی چلی گئی اور کتاب قانون اور یکے از ادلۂ اربعہ[۱] ہونے کی حیثیت مقدم اور مرکز توجہ بنتی چلی گئی۔ اور پھر جیسے جیسے مملکت اور سلطنت کے تقاضے پھیلتے گئے اور قانون کی عملداری وسیع ہوتی گئی قرآن مجید تو 'چار میں کے ایک' کی حیثیت میں پس منظر میں دھکیلا[۲] جاتا چلا گیا اور توجہات حدیث اور فقہ پر مرتکز ہوکر رہ گئیں[۳]۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علم اور حکمت کے میدان میں جو خلا اس طرح پیدا ہوا اُسے پُر کرنے کے لیے مصر و یونان کی جانب سے فلسفہ ومنطق کی آندھیاں آئیں نتیجۃً پورا عالم اسلام ارسطو کی منطق اور نوافلاطونی تصوّف کی آماجگاہ بن کر رہ گیا یہاں تک کہ فلسفہ واصولِ اخلاق کے لیے بھی مسلمانوں کو اغیار کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا[۴]! اور رفتہ رفتہ صورت یہ ہوگئی کہ قرآن نہ منبع ایمان رہا نہ سرچشمۂ یقین اور نہ مخزنِ اخلاق رہا نہ معدنِ حکمت ——— بلکہ صرف

---

[۱] اصول شریعت چار ہیں۔ قرآن، سنّتِ رسولؐ، قیاس، اجماع انہیں ادلۂ اربعہ کہا جاتا ہے

[۲] حضرت اکبرؔ کا بہت پیارا شعر ہے

صوم ہے ایمان سے، ایمان غائب صوم گُم　　　قوم ہے قرآن سے، قرآن رُخصت قوم گُم

(حواشی [۳] و [۴] اگلے صفحے پر دیکھیں)

ایک ایسی "کتابِ مقدس" بن کر رہ گیا جس کے الفاظ یا تو حصولِ برکت اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بن سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کام آسکتے ہیں سلہ۔ اور اس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ :

لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا — اسلام میں سے سوائے اُس کے نام کے اور
اِسْمُہٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ — کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے سوائے
اِلَّا رَسْمُہٗ (مشکوٰۃ : کتاب العلم) — صورتِ الفاظ کے اور کچھ نہ بچے گا۔

بعینہٖ یہی معاملہ 'جہاد' کے ساتھ بھی ہوا، جب اصل زور ایمان پر نہ رہا بلکہ اسلام پر ہو گیا تو جہاد بھی جو ایمانِ حقیقی کا رُکنِ رکین تھا خود بخود نگاہوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا۔ اور ساری توجہ ارکانِ اسلام پر مرتکز ہو گئی جن کی فہرست میں جہاد سرے سے شامل ہی نہیں ہے۔ گویا جہاد پر ظلم قرآن سے بھی بڑھ کر ہوا۔ اس لئے کہ قرآن تو خواہ 'چار میں کے ایک' کی حیثیت ہی سے سہی بہرحال شریعت کے اصول اربعہ میں شامل تو ہے، جہاد تو نہ صرف یہ کہ اسلام کے ارکانِ خمسہ میں شامل نہیں بلکہ نظامِ فقہ میں بھی اس کی حیثیت فرضِ عین کی نہیں صرف فرضِ کفایہ کی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جہاد کا تصور بھی مسخ ہو گیا اور اس شجرۂ طیبہ کی شاخوں کو جڑ اور تنے سے جدا کر کے ہر ایک کو مختلف رنگ دے دیا گیا چنانچہ ایک طرف جہاد مع النفس کا رُخ اعمال اور معاملات کی منجدھار سے پرے ہی پرے اذکار و اوراد اور نفسیاتی

سکے چنانچہ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ پر تو بے شمار تصانیف ملتی ہیں لیکن اصولِ تفسیر کے موضوع پر چودہ سو سال میں کل دو رسالے ملتے ہیں ایک امام ابنِ تیمیہؒ کا رسالہ 'اُصُولِ تفسیر' اور دوسرا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا رسالہ 'الفوز الکبیر'

سکے اسی کا مرثیہ کہا مولانا رومؒ نے اِن الفاظ میں ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں — حکمتِ قرآنیاں را ہم بخواں

سلے ایک تیسرا مصرف قرآن کا وہ ہے جو علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں بیان کیا : ؎

با آیاتش ترا کارے جزیں نیست — کہ از یاسینِ اُو آساں بمیری

ریاضتوں اور ورزشوں کی راہِ یسیر (SHORT-CUT) کے جانب موڑ دیا گیا اور دوسری طرف جہاد کو قتال کے ہم معنیٰ قرار دے کر اس کا مقصد مملکت کی سرحدوں کے تحفظ و دفاع اور بس چلے تو توسیع کے سوا کچھ نہ رہا۔ رہا شرک و ظلم، کفر و فسق اور زور و منکر کی ہر صورت کے ساتھ مسلسل کشمکش اور تصادم اور حق و صداقت کے پرچار، نیکی اور راستبازی کی ترویج، کلمۂ توحید کی نشر و اشاعت اور دینِ حق کے غلبہ و اقامت کے لیے پیہم جدّ و جُہد اور اس کے لیے سمع و طاعت کے اُصول پر مبنی نظامِ جماعت کے قیام کا معاملہ ـــــ گویا فی الجملہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی منظم سعی جو ہر مومن کے لیے فرضِ عین کا درجہ رکھتی ہے تو وہ یا تو سرے سے خارج از بحث ہو گئی یا زیادہ سے زیادہ ایک اضافی نیکی قرار پا کر رہ گئی اور اس سے بالا ہی بالا اور ورے ہی ورے اسلام و ایمان اور تقویٰ و احسان کے جملہ مراحل طے پانے لگے!

اللہ! اللہ کوئی فرق سا فرق ہے اور تفاوت سا تفاوت ابع "ببیں تفاوتِ رہ از کُجا ست تا بہ کُجا!" کے مصداق کُجا وہ کیفیت کہ صحابہ کرامؓ جذبۂ جہاد سے سرشار، بیک زبان، رجزیہ انداز میں یہ شعر پڑھ رہے ہیں:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا
عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا[1]

کُجا یہ حال کہ چودھویں صدی ہجری کے ایک مُتنبّی اور اُس کی ذُرّیتِ صلبی و معنوی نے تو جہاد بالسّیف کو باقاعدہ منسوخ ہی قرار دے دیا۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا حال بھی عملاً کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ع

"کہ رہوارِ لیتین ما بصحرائے گماں گم شد!"

(جاری ہے)

---

[1] (ترجمہ) ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے زندگی کے آخری سانس تک جہاد جاری رکھنے کی شرط پر محمدؐ کے ہاتھ پر بیعت کی ہے!

اسلام برّصغیر پاک و ہند میں!

(ماخوذ از ماہنامہ 'میثاق' بابت جنوری ۱۹۷۶ء)

- ورودِ اوّل : سندھ میں
- ورودِ ثانی : شمال مغرب سے
- ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج لیکن اسلام کے زوال کی انتہا : اکبر اعظم علیہ ما علیہ
- الفِ ثانی کا تجدیدی کارنامہ :
  - شیخ احمد سرہندیؒ
  - شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ
  - امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ

برِصغیر پاک و ہند میں خورشیدِ اسلام اوّلاً عینِ غرب یعنی مکران اور بلوچستان کے افق پر خلافتِ بنی اُمیّہ کے زمانے میں اس وقت طلوع ہوا جب نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے انتقال پر اسّی برس[1] بیت چکے تھے اور دورِ خلافتِ راشدہ کو ختم ہوئے بھی نصف صدی کے لگ بھگ عرصہ گذر چکا تھا اور اسلام کے صدرِ اوّل کا جوش و خروش کم ہوتے ہوتے تقریباً معدوم کے حکم میں داخل ہو چکا تھا۔ چنانچہ سرزمینِ ہند پر "بابُ الاسلام" سندھ کے راستے اسلام کا یہ ورودِ اوّل بھی کسی مثبت تبلیغی جذبے یا احساسِ فرض کا مرہونِ منّت نہ تھا بلکہ ایک وقتی اور فوری انتعال کا نتیجہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت اسلام کی کرنیں موجودہ پاکستان کے بھی صرف نصف جنوبی کو منوّر کر کے رہ گئیں اور اس مدّ میں بھی جذر کے آثار فوراً ہی شروع ہو گئے اور برِّ صغیر پاک و ہند میں اسلام کی یہ آمدِ اوّلین غلبہ محدود بھی رہی اور حد درجہ عارضی بھی۔

گویا سرزمینِ سند دورِ نبویؐ اور عہدِ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کی برکات سے تو مطلقاً محروم ہی رہی جس میں ایمان اور یقین کا کیف و سرور اور جہاد و قتال کا جوش و خروش باہم شیر و شکر تھے اور جہاد کی اصل غرض و غایت فریضۂ شہادت علی الناس کی ادائیگی کا جذبہ تھا یا حصولِ مرتبۂ شہادت[2] کا ذوق و شوق نہ کہ ملک گیری و کشور کشائی کی ہوس

---

[1] آنحضور کا سنِ وفات ۶۳۲ء ہے اور سندھ پر محمد بن قاسمؒ کا حملہ ۷۱۲ء میں ہوا۔ [2] بقول علامہ اقبال ؎

شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن ۔۔۔ نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

یا مالِ غنیمت و اسبابِ عیش کی حرص۔ مزید محرومی یہ رہی کہ اسے اس خالص عربی الاصل اسلام کے اثرات سے متمتع ہونے کا موقع بھی بہت ہی کم ملا جس میں دین و دنیا کی وحدت و یگانگت ابھی اس حد تک باقی تھی کہ رات کے راہب ہی دن کے شہسوار[1] ہوتے تھے اور ایک ہی انسان کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوتا تھا اور دوسرے میں تلوار!

بعد ازاں جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر تو اسلام کے انوار و برکات کا ترشح عرب تاجروں کی آمد و رفت کے طفیل تقریباً مسلسل ہوتا رہا، اگرچہ اس کی نوعیت ایک ہلکی سی پھوار یا دھیمی سی آنچ کی تھی جس کے اثرات زیادہ محسوس و مشہود نہیں ہوتے ——— لیکن شمال مغربی سرحد پر واقع پہاڑی دروں سے اسلام کا سیلاب کم و بیش تین صدیوں بعد شروع ہوا اور مزید لگ بھگ دو سو برس تک اس کی نوعیت واقعتہً پہاڑی ندی نالوں کے سیلاب ہی کی سی رہی کہ زور و شور اور غیظ و غضب کے ساتھ آیا اور آناً فاناً گذر گیا۔ اور اگرچہ اس بار مودہ پاکستان کے نصفِ شمالی کی قسمت جاگی کہ وہ ۱۰۰۰ء کے آس پاس ہی باقاعدہ اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا تاہم واقعہ یہی ہے کہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کی اصل حیثیت پہاڑی نالوں کے سیلاب سے زیادہ نہ تھی جو ادھر آتا ہے اُدھر گذر جاتا ہے!

تختِ دہلی پر مسلمانوں کو باقاعدہ تمکن ۱۲۰۶ء کے لگ بھگ حاصل ہوا، اور ہندوستان میں مسلمانوں کا دورِ حکومت عروج و زوال اور مدّ و جذر کے مختلف مدارج و مراحل سے گذرتا ہوا ۱۸۵۷ء کے غدر پر ختم ہو گیا۔ ان ساڑھے چھ سو سالوں کے نصف اوّل کے دوران، یعنی ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک پہلے کچھ ترکی النسل غلام بادشاہ[2] تختِ دہلی کو زینت بخشتے رہے اور بعد ازاں کچھ افغان خاندان (خلجی، لودھی وغیرہ۔)

---

[1] رستم، سپہ سالار افواجِ ایران کو اس کے مخبروں نے مسلمان افواج کے جو حالات سنائے تھے ان میں یہ الفاظ بھی ملتے ہیں کہ "هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ" یعنی "وہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شہسوار!"

[2] اگلے صفحہ پر دیکھئے

حکمران رہے، اور نصف ثانی یعنی ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک مغلوں کا دور ہے جس کے کل سوا تین سو سالوں میں سے پہلے پونے دو سو برس[1] اس کی اصل عظمت و سطوت کا زمانہ ہے اور بعد کے ڈیڑھ سو برس اصلاً ایک عظیم عمارت کے کھنڈروں میں تبدیل ہونے اور بالآخر زمیں بوس ہو جانے کا عرصہ! (ع "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی"!)

گویا ہندوستان میں اسلام آیا ہی اس وقت جب وہ اپنی نشأۃ اُولیٰ کے بعد زوالِ اوّل سے پوری شدّت کے ساتھ دوچار ہو چکا تھا۔ اور اس کی وحدتِ فکری بھی پارہ پارہ ہو چکی تھی اور وحدتِ ملّی بھی۔ چنانچہ ایک[1] طرف عالمِ اسلام کے قلب میں عرب قوّت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا اور خلافتِ بنی عبّاس کا دیا چراغِ سحری کے مانند ٹمٹما رہا[2] تھا اور پوری مملکت طوائف الملوکی کا شکار تھی گویا بنی اسمٰعیلؑ کے حق میں وعیدِ خداوندی "اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ" پوری طرح ظاہر ہو چکی تھی ——— اور دوسری[2] طرف خلافتِ اسلامی کی وہ توحیدی شان ایک داستانِ پارینہ بن چکی تھی جس میں دین و دنیا کے مابین کوئی دُوئی تھی نہ مذہب و ریاست میں کوئی جدائی اور خدا کے جلال[3] و جمال کے

ـلـے تاریخِ اسلام کا یہ دورِ عجیب ہے کہ از شرق تا غرب غلاموں ہی کی حکومتیں قائم تھیں۔ چنانچہ ہند میں خاندانِ غلاماں حکمران تھا تو مصر میں مملوک سریر آرائے مملکت تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے غلاموں کو کہاں سے اٹھا کر کہاں تک پہنچایا!۔

ـلـہ یعنی ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمۃ کی وفات تک!

ـلـہ چنانچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت کے آغاز کے نصف ہی صدی کے اندر اندر یہ چراغ بالکل بجھ گیا اور ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد میں وہ قتلِ عام ہوا کہ الامان و الحفیظ ——— اور آخری عبّاسی خلیفہ مستعصم باللہ اس طرح سرِ عام ذبح کر دیا گیا جیسے کسی بھیڑ یا بکری کو حلال کر دیا جائے۔ جس پر خون کے آنسو بہائے شیخ سعدیؒ نے :-

آسماں را حق بود گر خوں بہارد بر زمیں — بر زوالِ ملکِ مستعصم امیرالمؤمنیں!
اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری ز خاک — سر بروں آر و قیامت درمیانِ خلق بیں

ـ۳ـہ شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود — فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب

منصب جدا تھے نہ سلطانی و درویشی کے مصداق مختلف! ——— اور اس کی جگہ قیادت و سیادت اور رہنمائی و پیشوائی کے ضمن میں مُلوک، اَحبار اور رُہبان پر مشتمل وہ قدیم تثلیث[1] پوری طرح رائج و نافذ ہو چکی تھی جو ایک اسلام کے سوا دُنیا کی تہذیبوں اور تمدّنوں کا جزوِ لاینفک رہی ہے اور جس سے پیشگی خبردار کیا تھا عہدِ تابعینؒ ہی میں حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ نے اپنے اس حد درجہ فصیح و بلیغ شعر[2] میں ؎

وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلَّا الْمُلُوْکُ
وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَرُھْبَانُھَا

اور اگرچہ اسلام کے اعجاز نے اس دورِ زوال و انحطاط میں بھی بہت سی عظیم اور استثنائی (EXCEPTIONAL) شخصیتیں پیدا کیں جیسے صلاح الدّین ایوبیؒ اور ناصر الدّین محمودؒ ایسے درویش بادشاہ، اور امام ابن تیمیہؒ ایسی جامع سیف و قلم شخصیت، تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس دور تک ایک جانب مسلمان حکمران و سلاطین اکثر و بیشتر "آیۂ اِنَّ الْمُلُوْکَ[3]" کے مصداقِ کامل بن چکے تھے اور دوسری

---

[1] گویا علامہ اقبالؒ کا یہ شعر کہ ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

ظاہری طور پر بھی مطابق واقعہ ہے اور معنوی طور پر بھی۔ خصوصاً تاریخ اسلام کے اس دور میں جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے ایک طرف تثلیث کے فرزندوں نے صلیبی جنگوں سے عالم اسلام کا عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا اور دوسری طرف یہ معنوی تثلیث اسلام کی وحدانیت کی جڑیں کھوکھلی کر چکی تھی۔

[2] حضرت عبداللہ ابن المبارکؒ کے اس شعر کی اتنی ہی فصیح و بلیغ ترجمانی کی ہے علامہ اقبالؒ نے اپنے اس شعر میں: ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری!

[3] علامہ اقبالؒ مرحوم نے الفاظِ قرآنی " اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً (سورۃ النّمل: ۳۴) کے حوالے سے کس قدر عمدہ اشعار کہے ہیں: اشعار اگلے صفحہ پر دیکھئے

جانب علماء و صوفیاء کی عظیم اکثریت بھی آیاتِ قرآنی: "لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ" (المائدہ: ٦٣) اور "اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ" (توبہ: ٣٤) کی مظہرِ اتم بن چکی تھی۔ فَوَاحَسْرَتَا وَيَا اَسَفَا!

ہندوستان میں اسلام وارد تو ایسی منقسم حالت میں ہوا تھا کہ اصحابِ سیف و سناں جدا تھے اور صاحبانِ قرطاس و قلم جدا، اور زیبِ منبر و محراب اور تھے و زینتِ میدانِ جنگ و قتال اور۔ چنانچہ ابتداء میں ایک جانب محمود غزنوی اور محمد غوری کی سرفروشانہ ترکتازیاں تھیں اور دوسری جانب شیخ اسمٰعیل بخاری و شیخ علی ہجویری رحمہما اللہ کی تبلیغ و تلقین اور تعلیم و تربیت کی انتھک کوششیں اور بعد میں ایک طرف قطب الدین ایبک اور بختیار خلجی کی تلواریں مملکت کی توسیع اور استحکام کا فریضہ سرانجام دے رہی تھیں تو دوسری طرف خواجگانِ سلسلۂ چشت رحمہم اللہ نفوس کے تزکیے، قلوب کے تصفیے اور سیرت و کردار کی تعمیر میں مصروف تھے۔ تاہم غنیمت ہے کہ آغاز میں ان دونوں حلقوں کے مابین گہرا ربط و تعلق موجود تھا جس کا عظیم ترین نشان (SYMBOL) ہے سلطان التمش کی جامع الصفات شخصیت کہ ایک طرف ایک عظیم مملکت کا حکمران بھی تھا اور دوسری طرف خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کا حلقہ بگوش اور حد درجہ عابد و زاہد انسان بھی۔ —— یہاں تک کہ حضرتِ خواجہ کے انتقال پر جب

اشعار متعلقہ حاشیہ صفحہ سابقہ

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ المُلوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری
جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری
سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

لوگ نمازِ جنازہ کے لیے جمع ہوئے اور وہاں خواجہ مرحوم کی اس وصیت کا اعلان کیا گیا کہ میری نمازِ جنازہ صرف وہ شخص پڑھائے جس نے عمر بھر کبھی زنا نہ کیا ہو اور جس کی نہ کبھی تکبیرِ اُولیٰ فوت ہوئی ہو نہ عصر کی سنّتیں چھوٹی ہوں، نتیجۃً مجمعے پر سکتہ سا طاری ہو گیا اور تمام لوگ حیران و پریشان ہو کر رہ گئے کہ ایسا شخص کون ہو سکتا ہے جس میں یہ ساری شرطیں پوری موجود ہوں تو قدرے تأمّل و انتظار کے بعد جو شخص اگلی صف سے امامت کے لیے نکلا وہ خود بادشاہِ وقت سلطان التمش تھا۔!

لیکن جلد ہی یہ رابطہ کمزور پڑ گیا اور رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کے مابین ایک بُعد اور فصل پیدا ہو گیا اور اُن کے شب و روز ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بالکل متضاد ہو گئے اور جیسے جیسے وقت گزرا یہ خلیج عمیق سے عمیق تر اور وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

مزید برآں، ہندوستان میں اسلام علاقۂ ماوراءالنہر سے آیا تھا جہاں خود مذہبی حلقوں میں مدرسہ و خانقاہ کی تقسیم راسخ ہو چکی تھی اور اُن کے مابین مسابقت ہی نہیں منافرت کا آغاز ہو چکا تھا اور جہاں مدارس میں حنفی فقہ، اشعری و ماتریدی عقائد، یونانی فلسفہ و منطق اور ان سب کے معجونِ مرکّب علمِ کلام کا دور دَورہ تھا، اور خانقاہوں میں وحدتُ الوجود کا سکّہ رواں تھا۔ لہٰذا اسلامی ہند میں مذہب کی عمارت انہی دو ستونوں پر استوار ہوئی یعنی ایک شدید حنفیّت اور دوسرے وجودی تصوّف۔

قرآنِ حکیم یہاں ابتدا ہی سے صرف ایک کتابِ مقدّس کی حیثیّت سے متعارف ہوا اور علمِ حدیث سے یہ سرزمین دیر تک نابلد محض رہی اور چونکہ عربی یہاں صرف اعلیٰ علمی حلقوں تک محدود رہی اور عام بول چال، تصنیف و تالیف، شعر و ادب اور سرکار و دربار سب پر فارسی کا قبضہ رہا لہٰذا قرآن و حدیث سے یہ بُعد اور دُوری نہ صرف یہ کہ قائم رہی بلکہ مرورِ ایّام کے ساتھ مزید بڑھتی چلی گئی۔

اس غُلُوّ فی الحنفیّت اور بُعد عن حدیث الرّسولؐ کے ضمن میں ایک نہایت دلچسپ لیکن ساتھ ہی حد درجہ عبرت انگیز واقعہ نقل ہوا ہے کہ جب سلطانؒ کے دربار میں ایک خاص مسئلے پر شیخ الوقت خواجہ نظامُ الدّین اولیاء اور شیخ الاسلام قاضی جلال الدّین کے مابین مناظرہ ہوا اور اپنے موقف کے حق میں بطورِ دلیل پیش کرنا چاہا خواجہ نظام الدّینؒ نے ایک حدیث رسولؐ کو تو بلا کسی جھجک اور تامّل کے بھرے دربار میں ڈنکے کی چوٹ کہا شیخ الاسلام نے کہ :

"تو مقلّدِ ابوحنیفہ ہستی، تُرا با حدیثِ رسولؐ چہ کار؛ قولِ ابی حنیفہ بیار!"

تم مقلّدِ ابوحنیفہ ہو یعنی حنفی ہو تمھیں حدیثِ رسولؐ سے کیا سروکار؟ اگر امام حنیفہ کا کوئی قول پیش کر سکتے ہو تو کرو!

جس پر حضرتِ خواجہ نے یہ کہتے ہوئے مناظرہ ختم کر دیا اور دربار سے اُٹھ گئے کہ :

"سُبحان اللہ! کہ باوجود قولِ مصطفویؐ از من قولِ ابی حنیفہؒ می خواہند!" (سیر العارفین)

سُبحان اللہ! نبی اکرمؐ کے فرمان کے ہوتے ہوئے مجھ سے امام ابوحنیفہؒ کے قول کا مطالبہ کیا جا رہا ہے!

اُوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اسلامی ہند میں آغاز ہی سے دو حکومتیں قائم ہو گئی تھیں ایک ظاہری حکومت جس کا اقتدار یا زمین پر قائم تھا یا انسانوں کے جسموں پر' اور دوسری باطنی حکومت جس کا سکّہ قلوب کی دنیا میں رواں تھا۔ پہلی حکومت اصلاً ملوک و سلاطین اور اُمراء و عمائدِ سلطنت کی تھی اور ان کے ساتھ بطور تتمّہ یا ضمیمہ منسلک تھے ائمّہ و خطباء، مدرّسین و معلّمین اور مفتی و قاضی حضرات، اور اس دُنیا میں جیسے کہ عرض کیا گیا فقہ ہی کو گویا کُل دین کی حیثیت حاصل تھی! جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ متشدّدانہ ظاہر پرستی اور قانونی مُوشگافی کا دَور دَورہ ہو گیا اور رفتہ رفتہ دین و مذہب نے بالکل خشک قانونیت کی شکل اختیار کر لی

دوسری طرف، تصوّف کے خانوادوں میں سے ارضِ ہند پر سب سے پہلے چشتی سلسلے نے قدم جمائے اور کم و بیش دو صدیوں تک خواجگانِ چشت ہی کا طوطی بولتا رہا۔ جیسے ہی اس سلسلے میں قدرے ضعف کے آثار پیدا ہوئے وسطی اور جنوبی ہند میں سہروردیہ اور شطّاریہ سلسلوں کو فروغ حاصل ہوا اور شمال مغرب میں خصوصاً موجودہ پاکستان کے وسطی علاقوں میں قادریہ سلسلے نے عروج پایا ان تمام سلاسل میں وحدت الوجود کو گویا اُصولِ موضوعہ کی حیثیّت حاصل تھی اور اس کے زیرِ اثر کیف و سرور، جذب و مستی اور وجد و رقص کا ذوق و شوق بڑھ رہا تھا اور فنافی اللہ کو شغل و سلوک کے منتہائے مقصود کی حیثیّت حاصل ہو رہی تھی جس کے باعث قوی مضمحل ہو رہے تھے اور جذبۂ جہاد تو دُور رہا جذبۂ عمل بھی سرد پڑتا جا رہا تھا!

مزید برآں ——— باطنی احوال و کوائف پر توجّہ کے ارتکاز کے باعث ظاہر کی اہمیّت کم ہوتی جا رہی تھی، طریقت کے عروج کے ساتھ ساتھ شریعت کا استخفاف ہونے لگا تھا، عشق و محبّت کی سرمستی میں پابندیٔ شریعت اور اتّباعِ سُنّت پر پھبتیاں کسی جانے لگی تھیں اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہمہ اوستی نظریات کے باعث وسیع المشربی اتنی بڑھتی جا رہی تھی کہ رام اور رحمٰن ایک نظر آنے لگے تھے، مسجد و مندر اور دیر و کلیسا میں کوئی فرق نہ رہا تھا، اور یہ "با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام" پر عمل عام ہو گیا تھا نتیجۃً ملّتِ اسلامی کا جداگانہ تشخّص ہی شدید خطرات سے دوچار ہو گیا تھا۔

علمائے ظاہر یا "حاملانِ دین اور حامیانِ شرعِ متین" کی جانب سے اس طرزِ عمل کی مخالفت ایک فطری امر تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مدرسہ و خانقاہ کی باہمی چشمک رفتہ رفتہ بُغض اور عداوت میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اسلامی ہند کی پُوری تاریخ رجالِ سلطنت اور رجالِ دین کی باہمی کشمکش اور علماء اور صوفیاء کی باہمی آویزش کی مسلسل داستان ہے جس میں ایک 'بُعدِ رابع' (FOURTH DIMENSION) کا اضافہ ہو گیا اوائلِ عہدِ مغلیہ میں ایران سے شیعیّت کی درآمد، جس نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا اور جس کے زیرِ اثر مشرکانہ عقائد و خیالات اور بدعات

درسومات کا ایک سیلاب ارضِ ہند پر آگیا!

مسلم انڈیا کا سنہرا دَور بلا شبہ اُس کا صدرِ اوّل ہی تھا یعنی دَورِ خاندانِ غلاماں جس میں مُلوک، احبار، رہبان کی تثلیث اگرچہ اُصولاً تو موجود تھی تاہم بھی اس میں نہ تنزّل و انحطاط کے آثار نمایاں ہوئے تھے نہ باہمی بُغض و عناد کے ملکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے نہ صرف یہ کہ باہمی توافق و تعاون موجود تھا بلکہ بعض مثالیں انتہائی حسین امتزاج کی بھی نظر آجاتی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گذرا زوال اور پستی کے جانب قدم بڑھتے گئے اور نہ صرف یہ کہ متذکرہ بالا تثلیث کا گھناؤنا پن بڑھتا چلا گیا بلکہ اس کی جڑیں بھی مسلم سوسائٹی میں مزید گہری اترتی چلی گئیں! ——— تاآنکہ مغلِ اعظم شہنشاہِ اکبر کے زمانے میں یہ صورتِ حال اپنے نقطۂ عروج (CLIMAX) کو پہنچ گئی اور حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ عین اُس وقت جبکہ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں کا خورشیدِ حکومت نصف النّہار پر چمک رہا تھا اسلام پر انتہائی غربت اور شدید بے کسی و کس مپرسی کی حالت طاری ہوگئی! یہاں تک کہ نام نہاد 'دینِ الٰہی' نے دینِ محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کی کامل بیخ کنی کرنے یا کم از کم اُسے سرزمینِ ہند سے ملک بدر کر دینے کا بیڑا اٹھالیا! یہ دوسری بات ہے کہ فطرت کے اس اٹل قانون کے مطابق کہ جذر جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اسی کی کوکھ سے مدّ کے آثار جنم لیتے ہیں، ہندوستان میں اسلام کے زوال کی انتہا کا یہ دَور سرزمین پاک و ہند میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی تمہید بن گیا! بقول علّامہ اقبالؔ ؎

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں　　　توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری

سولہویں صدی عیسوی کے وسط کے لگ بھگ جب مغلِ اعظم علیہ ما علیہ کے آفتابِ اقتدار نے ابتدائی موانع و مشکلات کی بدلیوں سے نکل کر پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنا شروع ہی کیا[1] تھا اور ہندوستان میں اسلام کے انتہائی زوال و انحطاط کے دورِ سیاہ کا آغاز ہونے ہی والا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کہ ٹھیک اسی وقت سرزمینِ ہند میں دو[2]

---

[1] اکبری حکومت کو استحکام ۱۵۵۶ء میں پانی پت کی دوسری جنگ میں کامیاب ہونے کے بعد ہی حاصل ہوا تھا۔

خورشید ہدایت بھی طلوع ہوئے : ایک مجدّد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ (جن کی ولادت ۱۵۶۴ء میں ہوئی) اور دوسرے : حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ (جن کا سنِ ولادت ۱۵۵۱ء ہے!) جن کی مُصلحانہ و مجدّدانہ مساعی نے حالات کے دھارے کا رُخ اس حد تک موڑ کر رکھ دیا کہ تقریباً چار سو سال کے بعد اسلامی ہند کو غازی اورنگ زیب عالمگیرؒ کی ذات میں گویا غازی صلاح الدّین ایوبیؒ اور سلطان ناصرالدّین محمودؒ کے محاسن کا جامع حکمران نصیب ہوا اور اس طرح مسلم انڈیا کے اوّل و آخر کے مابین ایک مشابہت اور مماثلت پیدا ہوگئی!

ان میں سے مقدّم الذّکر یعنی شیخ مجدّد کی مساعی میں پُرجوش مجدّدانہ رنگ نمایاں تھا اور مؤخّر الذّکر یعنی شیخ محدّث کی کوششوں پر خاموش مُصلحانہ انداز غالب تھا۔ چنانچہ حالات کے رُخ کی فوری تبدیلی میں اصل دخل یقیناً حضرتِ مجدّد کی مساعی کو حاصل ہے جبکہ سرزمینِ ہند میں علمِ حدیثِ نبویؐ کا پودا لگانے کی جو خدمت حضرتِ محدّث نے سرانجام دی اس کے اثرات بہت دیرپا اور دُور رس ثابت ہوئے۔

حضرت مجدّدؒ کی تجدیدی مساعی کا اصل رُخ تصحیحِ عقاید، ردِّ بدعات، التزامِ شریعت اور اتّباعِ سنّت کی جانب تھا۔ اور اس ضمن میں انہوں نے رائج الوقت علمی و نظری اور اخلاقی و عملی ہر نوع کی گمراہیوں اور ضلالتوں پر بھرپور تنقید کی، چنانچہ تردیدِ شیعیت پر بھی نہ صرف یہ کہ ان کے مکاتیب میں بہت زور ہے بلکہ "ردِّ روافض" کے عنوان سے ایک مستقل رسالہ بھی انہوں نے تحریر فرمایا۔ اور اگرچہ ان کی ان اساسی کوششوں سے بھی 'طریقت' اور 'شریعت' کے بُعد کو کم کرنے اور اس بڑھتی ہوئی خلیج کے پاٹنے میں بہت مدد ملی تاہم اس میدان میں اُن کا اصل کارنامہ فلسفۂ وحدت الوجود کے مقابلے میں نظریۂ وحدت الشّہود کی تدوین و ترویج ہے جس نے ان تمام مفاسد کا سدِّباب کر دیا جو تصوّف کی راہ سے حملہ آور ہو رہے تھے، نتیجۃً باطن کے ساتھ ساتھ ظاہر کی اہمیّت بھی دوبارہ مسلّم ہوئی، عشق و محبّت کے ساتھ ساتھ اطاعت و اتّباع کا جذبہ بھی از سرِ نو بیدار ہوا، فنا فی اللہ کے بجائے بقا باللہ کو مقصود و مطلوب کا درجہ

حاصل ہوا اور جذب و سُکر اور مستی و بے خودی کے بجائے جذبۂ عمل اور جوشِ جہاد نمایاں ہوئے ——— اور ان سب کا حاصل یہ کہ ہند میں ملّتِ اسلامی کا جداگانہ تشخّص ازسرِنَو مستحکم ہوگیا۔ اور یہ خطرہ ٹل گیا کہ کہیں سرزمینِ ہند میں جیسے مذہبوں اور فلسفوں کے بہت بڑے عجائب گھر کی حیثیّت حاصل ہے دینِ محمّدیؐ بھی صرف ماضی کی ایک یادگار بن کر نہ رہ جائے بقول علّامہ اقبالؔ مرحوم :-

حاضر ہوا مَیں شیخ مُجدّدؒ کی لحد پر ۔۔۔ وہ خاک کہ ہے زیرِفلک مطلعِ انوار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے ۔۔۔ جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمئ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملّت کا نگہباں،
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

سلسلۂ نقشبندیہ، جس کا پودا سرزمینِ ہند میں حضرتِ مجدّدؒ کے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کے ہاتھ سے لگا، اصلاً بھی جملہ سلاسلِ طریقت میں سے اقرب اِلَی الشّریعت ہے، اور حضرتِ مجدّدؒ کے ہاتھوں جو عظیم الشّان کارنامہ سرانجام پایا اس کی بنیاد بھی خواجہ باقی باللہؒ کے ہاتھوں پڑ چکی تھی تاہم واقعہ یہ ہے کہ اس میں جو شان حضرت مجدّدؒ نے پیدا کی وہ انہی کا حصّہ ہے اور یوں تو بعد میں سلسلۂ نقشبندیہ یا تو یہ بھی ہندوستان میں جاری رہا اور اس سے بہت سا خیر پھیلا لیکن "ہند میں سرمایۂ ملّت کی نگہبانی" کا فریضہ جس شان کے ساتھ حضرتِ مجدّدؒ کے احفاد و خلفاء نے ادا کیا اس میں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ یہی وہ واحد سلسلہ ہے جس کے منسلکین نے ذکر و شغل اور مجاہدہ و ریاضت کے علاوہ کلمۂ حق کہنے کی پاداش اور ردِّ بدعت و رفض کے جُرم کی سزا کے طور پر حوالۂ زنداں ہونے اور جان پر کھیل جانے کی روایات کو بھی ازسرِنو تازہ کیا گویا ع "من ازسرِنو جلوہ دہم دار و رسن را!" (سرمدؔ)

بایں ہمہ، حضرتِ مجدّدؒ کے یہاں بھی حنفیّت میں غلوّ اُسی شدّت کے ساتھ موجود ہے جو مُسلم انڈیا کی پُوری تاریخ کا جزوِ لاینفک ہے۔ گویا حضرتِ مجدّدؒ کی مساعی سے اسلام ہند میں اس مقام تک تو پہنچ گیا جہاں سے (دورِ غلاماں میں) اِس کا آغاز ہُوا

تھا لیکن ع "دو قدم بیچ کی حرف ہے گردشِ ایّام ہوا!" کا عمل اس سے آگے نہ بڑھ سکا!

البتہ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ کی خدمات کو اس سمت میں ایک مزید قدم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ شیخ محدّثؒ کی شخصیت بعض پہلوؤں سے تو حضرت مجدّدؒ ہی کی شخصیت کا ظل معلوم ہوتی ہے لیکن بعض دوسرے اعتبارات سے اُن کی حیثیت تقریباً ایک ڈیڑھ صدی بعد طلوع ہونے والے آفتابِ رُشد و ہدایت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے پیشرو یا مقدمۃ الجیش کی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ صوفی بھی تھے اور حضرت خواجہ باقی باللہؒ ہی کے مرید بھی، لیکن اس کے باوجود کہ انھیں بھی وحدت الوجود سے اُنس تھا وہ اس کی تردید میں اس درجہ سرگرم نظر نہیں آتے۔ اسی طرح وہ حنفی بھی تھے لیکن متشدّد نہیں بلکہ فقہ حنفی کا رشتہ حدیثِ رسولؐ کے ساتھ جوڑنے کی سعی اوّلاً انھی سے شروع ہوئی۔ ان دونوں پہلوؤں سے تو وہ شیخ مجددؒ اور امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ الدہلویؒ کے بین بین نظر آتے ہیں لیکن اس اعتبار سے کہ امام الہندؒ نے اسلام کا رشتہ اس کی 'اصلِ ثابت' یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کی کوشش کا آغاز کیا اور شیخ محدّثؒ نے دین کا تعلق اُس 'اصلِ ثابت' کی فرعِ قرآن کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اُن کی شخصیت حضرت امام الہندؒ کی شخصیت کا مقدمہ یا دیباچہ نظر آتی ہے ——— اور واقعہ یہ ہے کہ یہی حضرتِ محدّثؒ کی اصل خدمت (CONTRIBUTION) ہے کہ انھوں نے علم حدیث کا پودا سرزمینِ ہند میں لگایا۔ اور حدیثِ رسولؐ کی باقاعدہ درس و تدریس کا بھی آغاز کیا اور اس سے متعلق تصنیف و تالیف کا بھی! چنانچہ انھوں نے مشکوٰۃ شریف کا ترجمہ فارسی میں کیا اور ان کے صاحبزادے شیخ الاسلام نور الحقؒ نے صحیح بخاری کو فارسی میں منتقل کیا۔ مزید برآں انھوں نے مشکوٰۃ کی ایک مفصّل شرح (لمعات التنقیح) عربی زبان میں اور اس سے بھی زیادہ طویل شرح (اَشِعّۃُ اللّمعات) فارسی میں تحریر کی، علاوہ ازیں اَسنادِ حدیث اور اسماءُ الرّجال پر بھی ایک کتاب تصنیف کی اور لمعات کے مقدمے کے ذریعے بھی عُلُومِ حدیث

کا ایک جامع تعارف کرادیا!

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تجدیدی مساعی کا تفصیلی جائزہ تو ظاہر ہے کہ ان مختصر شذرات کی حُدود سے باہر ہے تاہم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں ان کی سی جامعیّتِ کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیّت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعتہً دَورِ جدید کے فاتح ہیں اور اس اعتبار سے خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ انھوں نے حضرت مجدّدؒ اور شیخ محدّثؒ دونوں کی مساعی کو منطقی انتہا تک پہنچایا یا خواہ یہ کہہ لیا جائے کہ وہ دونوں اصلاً امام الہندؒ ہی کی شخصیّت کی تمہید تھے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک طرف حضرتِ مجدّدؒ نے ہند میں اُمّتِ مسلمہ کو ازسرِنَو ایک مستحکم داخلی تشخّص عطا کیا تو شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دے کر امّت کے خلاف اُٹھنے والے سب سے بڑے خارجی طوفان کے مقابلے کا سامان کیا اور حضرتِ مجدّدؒ نے "ردِّ روافض" سے جس کام کا آغاز فرمایا تھا اس کی تکمیل شاہ صاحبؒ نے "اِزالۃُ الخِفاء عن خلافۃ الخُلفاء" اور "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخینؓ" اور ان کے صاحبزادے شاہ عبد العزیزؒ نے "تحفۂ اثنا عشریہ" ایسی کتابوں کی تصنیف سے کی ——— اور دوسری طرف شیخ محدّثؒ نے علمِ حدیث کا جو پودا سرزمینِ ہند میں لگایا تھا شاہ صاحب اور ان کے خلفاء نے نہ صرف یہ کہ اس کی آبیاری کی بلکہ اپنی انتھک کوششوں سے صنم خانۂ ہند کو علمِ حدیث نبوی کا ایک عظیم الشّان چمن بنادیا۔ عجیب مشابہت ہے کہ شیخ عبد الحق محدّث دہلویؒ نے مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی اور ایک فارسی میں، اسی طرح امام الہندؒ نے امام مالکؒ کی ایک شرح عربی میں لکھی تھی (المسوّی) اور ایک فارسی میں (المصفّٰی) واضح رہے کہ شاہ صاحب کے نزدیک مؤطا امام مالکؒ کو علمِ حدیث کے ذخیرے میں [illegible] کی حیثیّت حاصل ہے۔

ان پر مستزاد ہیں شاہ صاحبؒ کے وہ کارنامے جن کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام

کی نشاۃِ ثانیہ کے طویل عمل کا اصل نقطۂ آغاز ان ہی کی ذاتِ گرامی ہے :

مثلاً ایک یہ کہ علمِ فقہ کے میدان میں ایک طرف آپؒ نے "عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید" تصنیف فرمائی جس سے تقلیدِ جامد اور اجتہادِ مطلق کے مابین اعتدال کی راہ واضح ہوئی اور دوسری طرف "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" ایسی معرکۃ الآرا کتاب لکھی جس نے فقہی اختلافات کی اہمیت کو کم کرنے کے ضمن میں نہایت دور رس نتائج پیدا کئے۔

دوسرے یہ کہ اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" کے ذریعے آپ نے حکمتِ دین کو ایک باقاعدہ علم کی حیثیت دے دی اور اسلام کے نظامِ عقائد، نظامِ عبادات، اور نظامِ معاشرت و معاملات کو ایک مربوط اور منضبط نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا۔ جس کی آنے والے دور میں شدید ترین ضرورت پیش آنے والی تھی ——— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اسلام کا رشتہ اس کی اصلِ ثابت یعنی قرآنِ حکیم کے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کے طویل عمل کا باقاعدہ آغاز فرما دیا۔ چنانچہ ایک طرف قرآن مجید کے فارسی ترجمے کے ذریعے قرآن کے مطالب و مفاہیم کو عوام تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ اگرچہ اس پر انھیں شدید مخالفت حتیٰ کہ عوامی یورش تک کا سامنا کرنا پڑا۔ اور دوسری طرف "الفوز الکبیر فی اصول التفسیر" کی تصنیف کے ذریعے علمِ تفسیر کو ایک چیستاں کے بجائے ایک باقاعدہ فن کی حیثیت سے متعارف کرایا اور درمیانی استعداد تک کے حامل لوگوں کے لیے فہمِ قرآن کی راہیں آسان کر دیں۔

شاہ صاحبؒ کے جلیل القدر فرزندوں میں سے دو یعنی شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن مجید کے بامحاورہ اور لفظی ترجمے کر کے گویا اپنے والدِ مرحوم کے شروع کئے ہوئے کام کو منطقی انتہا تک پہنچا دیا ——— اور کون کہہ سکتا ہے کہ آج برِصغیر پاک و ہند میں علم و فہمِ قرآن کا جو غلغلہ اور ہمہمہ ہے وہ سب دہلی کے اسی عظیم خانوادے کی مساعی کا نتیجہ نہیں!

الغرض ویسے تو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا علمی اصلاح و تجدید کا پورا

کارنامہ ہی نہایت رفیع اور قابلِ قدر ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی مساعی کو عالمِ اسلام میں یورپ کی پوری تحریکِ احیاء العلوم (RENAISSANCE) کا ہم پلّہ قرار دیا جاسکتا ہے لیکن ان کا عظیم تر بن کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توجّہات کو از سرِ نَو قرآنِ حکیم کے علم و حکمت کی جانب منعطف کر دیا ـــــ اور اللہ کی رسّی کے ساتھ اُمّتِ مُسلمہ کے تعلّق کو دوبارہ اُستوار کرنے کی سعی کا آغاز کرکے گویا حضرت ابوبکر صدّیقؓ کے اس قول کے مطابق کہ " لَا یُصْلِحُ اٰخِرَ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا " اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی سعی و جُہد کی راہ کھول دی ـــــ ! فَجَزَاہُ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاءِ !!

اُمّتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا اصل سبب اور اس کے جملہ امراض کا واحد علاج

حکیمِ مشرق علّامہ اقبال مرحوم

کے اشعار کی روشنی میں

خوار از مہجوریٔ قرآں شُدی — شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شُدی
اے چُوں شبنم بر زمیں افتندۂ — در بغل داری کتابِ زندۂ

○

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بقرآں زیستن
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست اُو — زندہ و پائندہ و گویا ست اُو

چوں بجاں در رفتِ جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شُد جہاں دیگر شود

تحریک

رجوع الی القرآن

(ماخوذ از ماہنامہ 'میثاق' بابت دسمبر ۱۹۷۶ء)

- خانوادۂ ولی اللّٰہیؒ اور تحریکِ شہیدینؒ
- عیسائیوں اور ہندوؤں کی جانب سے تبلیغی یلغار
- سرسیّد احمد خاں مرحوم اور آنجہانی غلام احمد قادیانی
- شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
- ڈاکٹر سر محمّد اقبال اور ڈاکٹر محمّد رفیع الدّین
- مولانا ابوالکلام آزاد اور سیّد ابوالاعلیٰ مودودی
- امام حمید الدّین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بارے میں ہم اپنا یہ تأثر بھی بیان کر چکے ہیں کہ "دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں اُن کی سی جامعیتِ کُبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعتہً دَورِ جدید کے فاتح ہیں ......" اور ساتھ ہی تجدیدِ دین اور احیائے اسلام کے بلند و بالا مقاصد کے لیے اُن کی ہمہ جہتی مساعی کا ایک اجمالی خاکہ بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ان مختلف النوع اور وسیع الاطراف مساعی میں ان کی اہم ترین خدمت یہ تھی کہ انہوں نے "اسلام کا رشتہ اس کی 'اصلِ ثابت' یعنی قرآنِ حکیم سے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کے طویل عمل کا باقاعدہ آغاز فرما دیا" ـــــــ اور یہ کہ "ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توجہات کو از سرِ نو قرآنِ حکیم کے علم و حکمت کی جانب منعطف کر دیا ـــــــ اور اللہ کی رسّی کے ساتھ اُمّتِ مسلمہ کے تعلق کو دوبارہ استوار کرنے کی سعی کا آغاز کر کے گویا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس قول کے مطابق کہ ـــــ 'لا یصلح اٰخر ھٰذہ الامّۃ الّا بما صلح بہ اوّلھا' ـــــ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی سعی و جہد کی راہ کھول دی!"

اس سے پہلے ہم یہ بھی واضح کر چکے تھے کہ صدرِ اوّل میں اسلام کی عظیم ترین حقیقتیں دو ہی تھیں :- ایک ایمان ـــــــ وہ ظاہری اور قانونی و فقہی ایمان نہیں جس کا تعلق 'اقرار باللّسان' سے ہے بلکہ وہ حقیقی اور قلبی ایمان جو یقین بن کر انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے ـــــــ اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جس کا مقصد ہو شہادت علی النّاس ـــــ 'اعلاءِ کلمۃِ اللہ' اور 'اظہارِ دینِ حق علی الدّین کلّہٖ' ـــــــ اور چونکہ ایمانِ حقیقی کا منبع و سرچشمہ ہے قرآنِ حکیم اور جہاد و قتال کی علامت ہے تلوار، لہٰذا مردِ مومن کی

شخصیت کا جو ہیولیٰ چشم تصور کے سامنے اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں بالکل بجا طور پر قرآن ہوتا ہے اور دوسرے میں تلوار!

یہ صحیح ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ کی اپنی زندگی میں سر بکف سیف بدست اور کفن بر دوش میدانِ جہاد و قتال میں نکلنے کا مرحلہ نہیں آیا لیکن —— —— یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان کی وفات کے نصف صدی کے اندر اندر جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا جو غلغلہ سرزمینِ ہند میں بلند ہوا وہ تمام تر ان ہی کی تجدیدی دعوت کی صدائے بازگشت تھی۔ اس لیے کہ خود حضرت سید احمد بریلوی ؒ بھی خانوادۂ ولی اللّٰہی ہی کے تربیت یافتہ تھے اور ان کے دستِ راست تو تھے ہی شاہ اسمٰعیل ؒ ابن شاہ عبدالغنی ؒ ابن شاہ ولی اللہ ؒ۔ اور اگرچہ انجام کار کے اعتبار سے ہندوستان کی یہ پہلی اسلامی تحریک "شعلۂ مستعجل" کا مصداق بن گئی لیکن اس کی خوش درخشیدگی، یقیناً ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہاں تک کہ واقعہ یہ ہے کہ اس تحریکِ جہاد کے وابستگان کے ایمان و یقین، ذوق و شوق اور جوش و خروش کے تذکرے سے بے اختیار صحابہ کرام ؓ یاد آجاتے ہیں اور سخت حیرت ہوتی ہے کہ "ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!" اور یہ ایک بیّن ثبوت ہے اس کا کہ اگر دعوت کی اساس اور منہجِ عمل وہی اختیار کیا جائے جو اسلام کے صدرِ اوّل میں کیا گیا تھا تو سیرت و کردار کے وہی نمونے آج بھی تیار ہو سکتے ہیں جو دورِ صحابہ ؓ کا طرۂ امتیاز ہیں۔ گویا بقول جگر مراد آبادی ؎

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی!
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

ہندوستان میں انگریز کے باقاعدہ عسکری تسلط کا آغاز تو ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی کے نتیجے میں گویا شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ کی زندگی ہی میں (ان کی وفات سے چھ سال قبل) ہو گیا تھا۔ تاہم اسے ایک باضابطہ کُل ہند سلطنت بننے میں پوری ایک صدی لگی یہاں تک کہ

۱۸۵۷ء کے غدر یا بغاوت کی صورت میں آخری ہچکی لے کر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا ساڑھے چھ صد سالہ دَور ختم ہوگیا۔ اور تاریخِ ہند کے برطانوی دَور کا آغاز ہوگیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کا نصف آخر اور انیسویں صدی کا نصف اوّل ہند میں سخت اضطراب و انتشار اور شکست و ریخت کا زمانہ ہے جس میں مسلمان بالخصوص حد درجہ مایوسی اور دل شکستگی کا شکار رہے۔ مایوسی کے اس غلبے میں جب کہ حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

ظاہر ہے کہ تحریک شہیدینؒ ایسی پُرعزیمت دعوت کا پنپنا اور کامیاب ہونا آسان نہ تھا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ۱۸۳۱ء میں شہیدینؒ نے "سجاک و خون غلطیدن" کی روش اختیار کر لی اور اپنے بہت سے رفقاء کے ساتھ جامِ شہادت نوش کرلیا اور اس طرح بالاکوٹ کی فضاؤں میں دعوت ولی اللّٰہی کی یہ پہلی صدائے بازگشت دم توڑ گئی ——— اور بعد میں اگرچہ مجاہدین مسلسل ع "من از سرِ نَو جلوہ دہم دار و رسن را!" پر عمل پیرا رہے اور ان کی مساعی کا سلسلہ بالآخر ریشمی رومالوں کی تحریک تک ممتد ہوا لیکن ظاہر ہے کہ اُن کا نتیجہ کوئی برآمد نہ ہوسکا ——— اور ہندوستان میں انگریز کا اقتدار اور قبضہ دن بدن مستحکم ہوتا چلا گیا۔

برطانوی دَور میں مسلمانانِ ہند زندگی اور موت کی جس کشمکش سے مسلسل دوچار رہے اس کے متعدد پہلو تھے، خالص دینی و مذہبی بھی، علمی و فکری بھی، سماجی و مجلسی بھی اور قومی و سیاسی بھی ——— ان میں سے اس وقت ہماری گفتگو خالص دینی و مذہبی کشمکش تک محدود ہے (قومی و سیاسی کشمکش کے بارے میں ہم نے ۱۹۶۷ء میں ان ہی صفحات میں تفصیل کے ساتھ اظہارِ رائے کیا تھا۔ یہ مضامین ان شاء اللہ جلد ہی کتابی صورت میں شائع کر دیئے جائیں گے!) ——— مزید برآں یہ چومکھی جنگ مسلمانوں کو بیک وقت دو دشمنوں سے لڑنی پڑی، انگریزوں سے بھی اور ہندوؤں سے بھی!

اور جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے اس میں اوّلاً مسلمانوں کو مدافعت ہی پر اکتفا کرتے بنی اور ایک طویل عرصے بعد ہی یہ صورت پیدا ہو سکی کہ قدم جما کر کسی مثبت اساس پر تعمیرِ جدید کی کوشش شروع کر سکیں۔

خالص مذہبی میدان میں مسلمانوں کو سب سے پہلے عیسائی مشنریوں کی یلغار سے سابقہ پیش آیا۔ ۱۸۲۶ء میں ہیبر (HABER) لارڈ بشپ آف کلکتہ نے براستہ دہلی بمبئی تک۔ پورے ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ مسلمانانِ ہند میں نہ کوئی مذہبی جذبہ باقی رہا ہے نہ سیاسی قوت۔ لہٰذا عیسائیوں کو کھل کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنی چاہیئے۔ چنانچہ عیسائی پادری چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور نوبت بایں جا رسید کہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر بھی عیسائیت کی تبلیغ ہونے لگی۔ تب وہی سُنّتِ الٰہی ظاہر ہوئی کہ ؎

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں،
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری!

اور یہ سعادت اسی خطّے کے حصّے میں آئی جس میں علم و حکمتِ ولی اللّٰہی کے چشمے بہہ رہے تھے کہ ضلع مظفر نگر کے قصبے کیرانہ سے مولانا رحمت اللہ نامی شخصیت ابھری جس نے پادری فینڈر (FANDER) کی کتاب "میزان الحق" کا دندان شکن اور مُسکت جواب "اظہار الحق" کے نام سے تحریر کیا۔ نتیجۃً پادری صاحب موصوف کو ہندوستان سے دُم دبا کر بھاگتے ہی بنی ——— (اور پھر جب اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز ترکی کو بنایا اور وہاں کے علماء کا ناک میں دم کر دیا اور وہاں سے طلبی پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی ترکی پہنچے تو وہاں سے بھی نو دو گیارہ ہو گیا)۔ مباحثے اور مناظرے میں اس شکستِ فاش کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد میں ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کھلے میدان میں خم ٹھونک کر کبھی نہ کی جا سکی۔ اور اس کی واحد ممکن صورت صرف یہ رہ گئی کہ پسماندہ طبقات کی تالیفِ قلب کے ذریعے کچھ لوگوں کے ناموں کے آگے پیچھے سے "مسیح" کا لاحقہ چسپاں کرا دو اور بس!

دوسری طرف عیسائی پادریوں کے دیکھا دیکھی ہندوؤں کی باسی کڑھی میں بھی ابال آگیا اور مسلمانوں پر ان کا تبلیغی حملہ دو صورتوں میں ہوا: ایک خالص رجعتی اور تنگ نظرانہ انداز میں دوسرے قدرے وسیع المشربی کے رنگ اور ترقی پسندانہ انداز میں ـــــ ان میں سے پہلے کا حشر تو اگرچہ عیسائی مشنریوں کے انجام جیسا ہی ہوا لیکن جس طرح کوئی بیمار جاتے جاتے مریض کے لیے کوئی اذیت بخش چیز چھوڑ جاتا ہے جسے عام گھریلو زبان میں بخار کا "موتا" کہتے ہیں اسی طرح یہ فتنہ بھی جاتے جاتے جسدِ ملت میں ایک سرطان کی جڑیں جما گیا ـــــ رہا دوسرے انداز کا حملہ تو اس نے میٹھی چھری والا کام کیا اور مسلمانانِ ہند کے اچھے بھلے حصے کو متاثر کیا یہاں تک کہ بعض انتہائی اہم شخصیتیں بھی اس کی زُلف گرہ گیر کی اسیر ہوگئیں۔

اوّل الذکر حملہ ـــــ آریہ سماجیوں کی جانب سے تھا۔ جنہوں نے ۱۸۶۵ء ہی سے لگ بھگ مسلمانوں کو للکارنا شروع کر دیا تھا اور ۱۸۷۵ء میں سوامی دیانند سرسوتی کی تصنیف "ستیارتھ پرکاش" کی اشاعت سے تو گویا یہ فتنہ عروج کو پہنچ گیا تھا۔ ان کے جواب کے لیے علماءِ حق بھی میدان میں آئے لیکن بدقسمتی سے اس میدان میں نمایاں حیثیت آنجہانی غلام احمد قادیانی کو حاصل ہوگئی جس نے ۱۸۸۳ء میں اپنی تالیف "سُرمۂ چشمِ آریہ" ہی کے ذریعے وہ ہردلعزیزی حاصل کی تھی جو اس کے ظرف سے بہت زیادہ ہونے کے باعث چھلک پڑی نتیجۃً وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسرے سینکڑوں اور ہزاروں کو بھی گمراہ کر گیا۔

مؤخر الذکر حملہ ـــــ برہمو سماج کی صورت میں سامنے آیا۔ جس کی تاسیس ۱۸۱۶ء میں راجہ رام موہن رائے (ولادت ۱۷۷۰ء، وفات ۱۸۳۳ء) نے کی تھی۔ عجیب بات ہے کہ یہ انتہائی ذہین و فطین اور عالم و فاضل شخص بھی پہلے اسلام اور مسلمانوں کی جانب سے مدافعت کرتے ہوئے ہی سامنے آیا۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو عیسائی مشنریوں کے حملے سے بچانے کے لیے "تحفۃ الموحدین" تصنیف کی اور اس طرح مسلمانوں میں ہردلعزیزی حاصل کرلی۔ بعد میں یہ شخص اپنشدوں کا پرچارک، ہندوستان کی عظمت و سطوتِ پارینہ کا نقیب اور ہندی نیشنلزم کا علمبردار بن کر سامنے آیا۔ اور مسلمانانِ ہند کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کرنے کے لیے اس نے اکبرِ اعظم علیہ ما علیہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دینِ الٰہی

کے حربے کے طور پر ’وحدتِ ادیان‘ کا فلسفہ ایجاد کیا۔ جس کے ناوک نے اچھے اچھوں کو زخمی کیا اور بڑے بڑوں کے دلوں کو چھید ڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کی پوری تحریک اسی ایک شخص کے ظلّ اور بروز کی حیثیت رکھتی ہے اور گاندھی جی کی شخصیّت پہ سب سے گہری چھاپ اسی کی نظر آتی ہے۔ عجیب مماثلت ہے کہ جس طرح راجہ جی نے اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت میں ”تحفۃ الموحّدین“ تالیف کی اسی طرح گاندھی جی نے مسلمانوں کی تالیفِ قلب کے لیے تحریکِ خلافت میں شمولیّت اختیار کی اور وحدتِ ادیان کے فلسفے کو اتنا اُچھالا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جیسی عظیم اور نابغہ شخصیّت بھی اس کی زلفِ گرہ گیر کی اسیر ہو گئی ع ”ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں !“

مسلمانانِ ہند کی مثبت احیائی مساعی کا آغاز دراصل بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا سے ہوا۔ یہ مساعی قومی و ملّی سطح پر اور خالص سیاسی میدان میں بھی ہوئیں اور علمی و فکری سطح پر بھی۔ ہم مختلف مواقع پہ اس احیائی عمل کے مختلف پہلوؤں پہ اظہارِ رائے کر چکے ہیں۔ آج ہمیں اس ہمہ جہتی عمل کے اس پہلو پہ روشنی ڈالنی ہے جو ہمارے نزدیک خالص تجدیدِ و احیائے دین اور ٹھیٹھ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے اعتبار سے اہم ترین ہے —— اور وہ یہ کہ بحمد اللہ نگاہوں کا ارتکاز رفتہ رفتہ قرآن مجید پہ ہوتا جا رہا ہے اور اُمّتِ مسلمہ جو کلام اللہ سے بالکل بیگانہ ہو گئی تھی دوبارہ اس کی طرف متوجّہ ہو رہی ہے۔

اس عمل کا آغاز جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے قرآن مجید کے فارسی ترجمے اور ”الفوز الکبیر فی اُصُول التّفسیر“ کی تالیف سے کیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ان کے دو صاحبزادوں، شاہ رفیع الدّینؒ، اور شاہ عبدالقادرؒ کے علی التّرتیب لفظی و با محاورہ اردو ترجمے شائع ہوئے (شاہ رفیع الدّینؒ کا ۱۸۰۵ء میں اور شاہ عبدالقادرؒ کا ۱۸۱۰ء میں) —— انیسویں صدی کا اکثر حصّہ اگرچہ سیاسی شکست و ریخت اور عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے ساتھ مباحثوں اور مناظروں میں بیت گیا۔ تاہم اس کے اواخر ہی میں ’رُجُوع اِلَی القرآن‘ کا وہ عمل پھر شروع ہو گیا تھا جو بیسویں صدی کے اوائل میں پُوری شدّت کو پہنچا۔

رُجُوع الی القرآن کے اس عمل کا جائزہ لیتے ہوئے یہ امر پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ آغازِ کار میں اس میں ان گروہوں نے بھی حصّہ لیا جو بعد میں انتہائی غلط راہوں پر چل نکلے اور ضَلُّوا وَ اَضَلُّوا کا مصداقِ کامل بن گئے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو "ضَلُّوا ضَلٰلًا م بَعِیْدًا" کی اس حد کو پہنچ گئے کہ اُمّت کو مجبوراً ان کا تعلق اپنے سے منقطع کرنا پڑا جیسے قادیانی، اور وہ بھی ہیں جن کی یا تو گمراہی اس درجے کی نہ تھی یا اہمیّت اتنی نہ تھی کہ یہ انتہائی قدم اُٹھایا جاتا جیسے چکڑالوی و پرویزی ——— تاہم چونکہ انہوں نے بھی قرآن حکیم کی جانب انتکازِ توجّہ کے عمل میں صحیح یا غلط طور پر کچھ حصّہ لیا ہے لہٰذا ان کا ذکر کیا جا رہا ہے ——— اسے کسی بھی درجے میں ان کی تائید کے مترادف نہ سمجھا جائے۔

سب سے پہلے تو اندازہ کرنا چاہیئے کہ گذشتہ صدی کے ربع آخر اور موجودہ صدی کے ربع اوّل میں ترجمہ و تفسیرِ قرآن کے ذیل میں برّصغیر پاک و ہند میں کس قدر کام ہوا:

(۱) سب سے پہلے سرسیّد احمد خاں مرحوم نے ۱۸۷۵ء میں اپنے ہفت روزہ اخبار 'تہذیبُ الاخلاق' میں تفسیرِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جو گیارہ سال میں پندرہ پاروں تک پہنچ کر رُک گیا۔

(۲) ۱۹۰۳ء میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۳) ۱۹۰۶ء میں مرزا حیرت دہلوی " " " " "

(۴) ۱۹۱۰ء میں مولوی فتح محمّد جالندھری " " " " "

(۵) ۱۹۰۵ء میں مولوی عبد اللہ چکڑالوی کی تفسیر شائع ہوئی

(۶) ۱۹۰۱ء میں مرزا ابو الفضل ایرانی (شیعہ) نے انگریزی میں ترجمہ شائع کیا اس کو دیکھ کر نواب عماد الملک بلگرامی نے اس سے بہتر ترجمہ شروع کیا۔ لیکن سولہ پاروں تک ہی پہنچ پائے تھے کہ فوت ہو گئے۔ لہٰذا یہ نامکمل رہ گیا اور شائع نہ ہو سکا۔

(۷) ۱۹۰۶ء مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن لکھنی شروع کی جو ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوئی۔

(۸) ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کا ترجمہ مع

مختصر حواشی شائع ہوا (حواشی سورۂ نساء تک حضرت شیخ الہندؒ کے ہیں اور باقی مولینا شبیرؒ احمد عثمانی رحمہ کے)

(۹) ۱۹۱۷ء میں محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمہ قرآن مع مختصر حواشی شائع ہوا (اسے اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ ۱۹۲۰ء تک کل تین برس میں اس کے تیس ہزار نسخے فروخت ہوگئے!)

(۱۰) ۱۹۲۲ء میں محمد علی لاہوری ہی کی اردو تفسیر شائع ہوئی، اس کا نام بھی 'بیان القرآن' ہی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ فہرست کسی طرح بھی مکمل نہیں کہلا سکتی، تاہم اس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ اعتناء و التفات کا ایک سلسلہ گذشتہ صدی کے اواخر سے شروع ہوگیا تھا اور اس صدی کے رُبعِ اوّل کے ختم ہوتے تک خاصی دلچسپی مسلمانانِ ہند کو قرآنِ حکیم اور اس کے عُلوم و معارف کے ساتھ پیدا ہوچکی تھی۔

ہم اس سے قبل ایک موقع پر قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کرچکے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں ملّتِ اسلامی کی نشاۃِ ثانیہ کے عمل کے دوران دو متضاد نقطۂ نظر اور طرز ہائے فکر پروان چڑھنے گئے۔ ایک وہ جس کا منبع و سرچشمہ علی گڑھ بنا اور دوسرے وہ جس کے مرکز و محور کی حیثیت دیوبند کو حاصل ہوئی۔ ابتدا میں راسخ العقیدہ علماء کی گرفت مسلم معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ علی گڑھی طرزِ فکر کو اپنے لیے راستہ بنانے میں شدید مخالفت و مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن بعد میں حالات کے تقاضوں کے تحت اُس کے اثرات وسیع سے وسیع تر ہونے چلے گئے اور علماء کا حلقۂ اثر سکڑتا چلا گیا۔ تاہم اب بھی ہمارے جسدِ ملّی کے بحرِ محیط میں یہ دونوں رَوئیں بالکل مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ کی سی شان کے ساتھ بہہ رہی ہیں۔ اور اگرچہ قومی و سیاسی میدان میں علی گڑھی مکتبِ فکر کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تاہم مذہبی میدان میں اب بھی غلبہ و اقتدار راسخ العقیدہ علماء ہی کو حاصل ہے!!!

اس تفرقہ و اختلاف کے جو اثرات ہماری قومی و سیاسی جدّ و جہد پر مترتّب ہوئے وہ ہماری اس وقت کی گفتگو کے موضوع سے خارج ہیں۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قرآنِ حکیم کے جانب توجّہ و التفات کا جو رُجحان پیدا ہوا اس میں بھی یہ دونوں رنگ بالکل علیٰحدہ علیٰحدہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ متذکرہ بالا تراجم و تفاسیر کو بنیادی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ایک متجدّدانہ رنگ کی حامل تفاسیر جن کے ضمن میں سر سیّد احمد خاں مرحوم کی تفسیر کو اصل الاصول کی حیثیّت حاصل ہے اور دوسری روایتی انداز کی راسخ العقیدہ تفاسیر جن میں حضرت شیخ الہند کا ترجمہ اور مولانا تھانویؒ کی تفسیر بنیادی اور اساسی اہمیّت کی حامل ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر یا بالفاظِ دیگر "فکرِ قرآنی" کے میدان میں خواہ مولوی عبد اللہ چکڑالوی کی چکڑالویّت ہو خواہ محمد علی لاہوری کی لاہوریّت، اور خواہ علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی کی مشرقیّت ہو خواہ چودھری غلام احمد پرویز کی پرویزیّت، یہ سب فکرِ سر سیّد ہی کی شاخیں ہیں۔ اور دوسری طرف مولانا تھانویؒ کی "بیان القرآن" پر مبنی تین مزید تفسیریں منصّۂ شہود پر آ چکی ہیں، ایک مولانا عبد الماجد دریا بادی کی تفسیر جس میں تقابلِ ادیان اور خصوصًا بائبل ہسٹری کے ضمن میں بہت مفید مباحث ہیں دوسری مولانا محمد ادریسؒ کاندھلوی کی تفسیر جس میں کلامی مسائل پر زیادہ توجّہ کی گئی ہے اور تیسری مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیر جس میں فقہی مسائل سے زیادہ اعتنا کیا گیا ہے۔

جہاں تک مقدّم الذّکر مکاتبِ فکر کا تعلّق ہے، ہمیں ان سے قطعًا کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ہم انہیں ضلالت و گمراہی ہی کے مختلف رنگ (SHADES) سمجھتے ہیں۔ بایں ہمہ اس جائزے میں ان کا ذکر دو وجوہ سے کیا گیا ہے: ایک یہ کہ اُن کی مساعی سے بھی اُمّت کے بعض عناصر میں قرآن مجید سے ایک دلچسپی پیدا ہوئی اور اگرچہ اُن کے زیرِ اثر یہ دلچسپی غلط رُخ پر پڑ گئی تاہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر قرآن حکیم کے حقیقی اور اصلی علوم و معارف پیش کئے جائیں تو ان مکاتبِ فکر سے منسلک لوگوں کو بآسانی

راغب کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اِن مکاتبِ فکر نے گویا ایک دعویٰ (THESIS) کی شکل اختیار کر لی جس کے جوابِ دعویٰ (ANTI-THESIS) کے طور پر راسخ العقیدہ علماء کو ترجمہ و تفسیرِ قرآن کی جانب متوجّہ ہونا پڑا اور اس طرح ایک بڑا ذخیرہ اُردو تراجم و تفاسیر کا تیار ہو گیا۔ جس سے قرآن مجید کی جانب عوام کی توجّہات کے انعطاف کا عمل تیز تر ہو گیا ــــ

ویسے یہ عرض کرنا غالباً خارج از محل شمار نہیں ہوگا کہ خود علماء کے حلقوں میں تا حال قرآن حکیم پر توجّہ اس درجہ مرکوز نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ راقم الحروف نے ایک بار مولانا سیّد محمّد یوسف بنوری مدظلہٗ سے دریافت کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ اُصُولِ حدیث اور اُصُولِ فقہ پر تو ہمارے یہاں ضخیم تصانیف موجود ہیں لیکن اُصُولِ تفسیر پر کُل دو مختصر رسالے ملتے ہیں ایک امام ابن تیمیہؒ کا اور دوسرا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا؟ ـــــ اِس کا جواب، تو مولانا نے قدرے توقّف کے بعد یہ دیا کہ اصل میں اُصُولِ فقہ کی کتابوں میں اُصُولِ تفسیر بھی زیرِ بحث آ جاتے ہیں لہٰذا علیحدہ تصانیف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن جب میں نے دریافت کیا کہ اِس کا کیا سبب ہے کہ آپ کے دار العلوم میں تخصّص فی الحدیث کا شعبہ بھی ہے اور تخصّص فی الفقہ کا بھی لیکن تخصّص فی التفسیر کا شعبہ موجود نہیں ہے؟ تو اس پر مولانا نے پُوری فراخدلی کے ساتھ تسلیم فرمایا کہ یہ ہماری کوتاہی ہے! اسی طرح حیرت ہوتی ہے کہ حلقۂ دیوبند کے علمائے کرام کے دلوں میں حضرت شیخ الہندؒ کا جو مقام و مرتبہ ہونا چاہیئے اور فی الواقع ہے وہ اظہر من الشّمس ہے لیکن اُن کی آخری نصیحتوں میں سے اہم ترین نصیحت جسے نقل فرمایا مفتی محمّد شفیعؒ نے اس پر عمل کہیں نظر نہیں آتا ــــــ الّا ماشاء اللہ (شیخ الہند کی یہ نصیحت بروایت مفتی محمّد شفیعؒ ص۲۱ پر دیکھیں)

بہر حال علی گڑھ اور دیوبند کی ان دو انتہاؤں کے مابین ملّتِ اسلامیۂ ہند کے محیط میں فکرِ قرآنی کے تین سوتے اور پھُوٹے جنہیں مجموعی طور پر SYNTHESIS سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک وہ جس کا منبع اور سرچشمہ بنے علّامہ اقبالؔ مرحوم جو معروف و متداول معنوں

میں تو نہ مترجمِ قرآن تھے نہ مفسرِ قرآن ۔ بلکہ اُن کی تعلیم بھی نہ کسی دار العلوم میں ہوئی تھی، نہ جامعۂ اسلامیہ میں ۔ اس کے برعکس وہ سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ اور یونیورسٹیوں سے فیض یافتہ تھے ۔ بایں ہمہ قرآنِ حکیم کی ترجمانی کے اعتبار سے اُن کا مقام یقیناً 'رومیٔ ثانی' کا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ مناجات بحضور سیّد المرسلینؐ میں یہ تک کہہ دیا کہ :

گر دلم آئینۂ بے جوہر است　　ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن　　ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا　　بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

چنانچہ اُن کے اشعار تو ایمان و یقین کے کیف و سرور، محبّتِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ کے سوز و گداز اور جذبہ و جوشِ ملّی سے مملو ہیں ہی ۔ اُن کے 'خطبات' بھی درحقیقت وقت کی اعلیٰ ترین فکری سطح پر مطالعۂ قرآنِ حکیم ہی کی ایک کوشش کا مظہر ہیں جس کے ذریعے علّامہ مرحوم نے جدید ریاضیات و طبعیات اور فلسفہ و نفسیات کا رشتہ قرآنِ حکیم کی اساسی تعلیمات کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بغیر دورِ حاضر میں دین و مذہب کی گاڑی کا آگے چلنا محالِ مطلق ہے ۔

علّامہ مرحوم کی اس فکری کاوش کے ضمن میں اُن کے معروف ہم نشینوں نے تو کوئی مزید کام نہیں کیا ۔ البتّہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اس سلسلے میں خاصی وسیع خدمات سرانجام دیں ۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف 'قرآن اور علمِ جدید' نامی تالیف کے ذریعے بعض جدید اور اہم نظریوں اور فلسفوں جیسے ڈارون کا نظریۂ ارتقاء، فرائیڈ کا نظریۂ جنس، مارکس کا نظریۂ جدلی مادیت وغیرہ کا جائزہ قرآن حکیم کی روشنی میں لیا اور ان کے صحیح اور غلط اجزاء کی نشاندہی کی کوشش کی ۔ اور دوسری طرف "IDEOLOGY OF THE FUTURE" نامی تصنیف کے ذریعے علّامہ مرحوم کے فلسفۂ خودی کو ایک مرتّب اور منظّم نظامِ فکر کی حیثیت سے واضح کیا اور ثابت کیا کہ نوعِ انسانی کا مستقبل اسی نظریے کے ساتھ وابستہ ہے ۔

(۲) برِّصغیر میں قرآنی فکر کا دوسرا دھارا مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت سے پھوٹا جس پر فکر سے زیادہ دعوت کا رنگ غالب تھا۔ مولانا مرحوم مفسرِ قرآن کی حیثیت سے تو بہت بعد میں متعارف ہوئے اس لیے کہ 'ترجمان القرآن' کی جلد اوّل ۱۹۳۱ء کے لگ بھگ شائع ہوئی تاہم اُن کی قرآن حکیم کی ترجمانی اور قیامِ حکومتِ الٰہیہ کیلئے دعوت جہاد کا ڈنکا برِّصغیر کے طول و عرض میں ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے بج چکا تھا۔ اور اس ضمن میں وہ حضرت شیخ الہندؒ ایسی عظیم شخصیت تک سے خراجِ تحسین وصول کر چکے تھے ——— افسوس ہے کہ ۱۹۲۰، ۱۹۲۱ء میں جب بعض علماء کی مخالفت کے باعث مولانا مرحوم 'امام الہند' کے منصب پر فائز ہوتے ہوتے رہ گئے تو ایک شدید ردِّعمل اُن کی طبیعت میں پیدا ہوا اور وہ ؎

"یہ صُور پھونک کر تم سو گئے کہاں آخر؟"

کے مصداق اس راہ ہی کو تج کر انڈین نیشنل کانگرس کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے اور اس طرح کم از کم عارضی طور پر برِّصغیر میں قرآنی فکر کے اس دھارے کے سوتے خشک ہو گئے! (مزید افسوسناک امر یہ کہ گاندھی جی کی شخصیت کے زیرِ اثر مولانا مرحوم 'وحدتِ ادیان' کے بھی پرچارک بن گئے۔ اور اس طرح گویا 'برہمو سماج' کی تقویت کا ذریعہ بن گئے!)

تاہم 'الہلال' اور 'البلاغ' کی دعوت اتنی بودی اور بے جان نہ تھی کہ اس طرح ختم ہو جاتی۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی ایک دوسری فعّال شخصیت کی صورت میں ظہور کر لیا جس نے اوّلاً مولانا آزاد مرحوم کے نعرۂ جہاد کو ایک مبسوط تصنیف کا موضوع بنایا اور 'الجہاد فی الاسلام' ایسی معرکۃ الآرا کتاب بالکل نوعمری میں لکھ ڈالی اور پھر ۱۹۳۲ء سے مولانا آزاد کی تفسیر 'ترجمان القرآن' کے ہم نام ماہنامے کے ذریعے قرآنِ حکیم کی ترجمانی اور خاص طور پر اس کی انقلابی دعوت کے تسلسل کو باقی رکھا۔ یہ ہیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جنھوں نے ایک طرف 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' کے نصب العین کے پیشِ نظر ۱۹۴۱ء میں 'جماعتِ اسلامی' قائم کی اور دوسری طرف 'تفہیم القرآن' کے ذریعے قرآن مجید کی تعلیمات اور خصوصاً اُس کی انقلابی دعوت کا تعارُف برِّصغیر کے طول و عرض میں بالخصوص جدید تعلیم یافتہ نسل کے ایک بہت بڑے حلقے میں کرا دیا ——— اور اگرچہ اس پر جتنا افسوس

کیا جائے کم ہے کہ اپنے پیشرو کی طرح جو ایک وقتی سی رکاوٹ سے بد دل ہو کر کانٹا ہی بدل گیا تھا، مولانا مودودی بھی قیامِ پاکستان کے وقت کچھ فوری سی توقعات اور وقتی سے امکانات سے دھوکہ کھا کر پاکستانی سیاست کے گرداب میں کود پڑے۔ اور پورے تیس برس ہونے کو آئے کہ وہ پوری جماعت سمیت اسی صحرائے تیہہ میں سرگرداں ہیں (اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ چالیس سال پورے کر کے بھی انہیں یا اُن کی جماعت کو اس صحرانوردی سے نجات ملے گی یا نہیں؟) ——— اور اس پر بھی جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ عمر کے آخری مرحلے میں 'خلافت اور مُلوکیّت' نامی تالیف کے ذریعے مولانا مودودی رفض اور تشیّع کی تقویّت کا موجب بن گئے، تاہم اُن کی خدمات بالکل رائگاں جانے والی نہیں ہیں۔ انہوں نے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کے دلوں میں اسلام کے غلبے کی آرزو پیدا کی ہے اور ہزاروں کو اس جدّ و جُہد میں عملاً مبتلا کیا ہے۔ اور اگرچہ ایک غلط فیصلے اور اس پر بیجا اصرار نے اُن کی چالیس سالہ مساعی کو غلط رُخ پر ڈال کر رکھ دیا ہے۔ تاہم قرآن کی انقلابی دعوت کا جو صُور انہوں نے پھُونکا ہے وہ یقیناً بہت سے دلوں کو گرماتا رہے گا اور کیا عجب کہ ابوالکلام آزاد مرحوم ثُمّ ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ دعوتِ جہاد پھر کسی گوشے سے نئی آب و تاب اور تازہ جوش و خروش کے ساتھ اُبھرے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ!

(۳) وہ عظیم شخصیّت جس سے برِّصغیر میں دیوبند اور علی گڑھ کے مابین قرآنی فکر کا تیسرا سوتا پھُوٹا، مولانا حمید الدّین فراہیؒ کی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ قدیم اور جدید کا حسین ترین امتزاج اُن ہی کی ذات میں ہوا[1]۔ انہوں نے بیس سال ہی کی عمر میں اس دَور کے چوٹی کے علماء سے فارسی، عربی اور دینی عُلوم کی تحصیل مکمّل کر لی تھی۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ کے

---

[1] چنانچہ امام فراہیؒ کی وفات پر جو تعزیتی مضمون مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے ماہنامہ معارف شمارہ ۱، ۲ جلد ۲۷ بابت جنوری و فروری ۱۹۳۱ء میں مولانا فراہیؒ ہی کے اس شعر کو عنوان بنا کر لکھا تھا کہ ؎

فغاں کہ گشت نیوشندہ سخن خاموش　　وگر چگونہ تسلّی کنم من ایں لب و گوش

اس کے مندرجہ ذیل ابتدائی الفاظ قابلِ توجّہ ہیں: ——— بقیہ اگلے صفحہ پر

ماحول میں رہے اور وہاں انہوں نے انگریزی زبان اور ذکرِ جدید کا مطالعہ براہِ راست کیا۔ اور پھر اُن کی نگاہیں قرآن حکیم پر مرتکز ہوگئیں اور انہوں نے باقی پوری زندگی حکمتِ قرآنی کی گہرائیوں میں غوطے لگانے میں بسر کر دی۔ اور اگرچہ اُن کا مزاج "کمانا اور لے دوڑی" کے بالکل برعکس "نیکی کر دریا میں ڈال" والا تھا۔ چنانچہ اپنی زندگی میں مفسّر یا مُصنّف و مؤلّف کی حیثیت سے شہرت پانے کی کوئی کوشش انہوں نے نہیں کی بلکہ جو کچھ لکھا اُسے حوالۂ صندوق کرتے چلے گئے۔ تاہم اُن کی جو چند مختصر چیزیں اُن کی زندگی

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

"اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علماء کا ماتم کیا گیا ہے، وہ کل وہ تھے، جن کی ولادت اور نشوونما انقلابِ زمانہ سے پہلے ہوئی تھی، آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں۔ ہم ایک ایسے گریجویٹ عالم کا ماتم کرتے ہیں جو اپنے علم و فضل، زہد و ورع اور اخلاق و فضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن جو اپنی روشن خیالی جدید علوم و فنون کی اطلاع و واقفیت اور مقتضیاتِ زمانہ کے علم و فہم میں عہدِ حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا۔ اس سے پہلے ان تمام علماء نے جو نئے علمِ کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا، وہ دوسروں سے سُنی سنائی باتیں تھیں۔ لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی، جس نے فلسفۂ حال کے متعلق نفیاً یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ سے۔

آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علماء کی مثالیں ہیں جنہوں نے عربی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی شروع کی اور بی۔ اے اور ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سندیں حاصل کیں، لیکن اس طرح کہ ع "جو پڑھا لکھا تھا نیازؔ نے اسے صاف دل سے بھلا دیا" نئے رنگ نے پرانے رنگ کو اتنا پھیکا کر دیا کہ ان پر اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا، لیکن آج ہم جس ہستی کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کا حال یہ تھا کہ اس نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پرانے رنگ کا گہرا پن اور بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڑھ کالج اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی سادگی کو دیکھ کر عوام بظاہر اس کو عالم بھی بمشکل ہی باور کر سکتے تھے مگر وہ، وہ تھے جو اب تک زمانہ میں کوئی نہیں۔"

ہی میں شائع ہوئیں انہوں نے ان کے ' تدبّرِ قرآن ' کا لوہا وقت کے چوٹی کے علماء و فضلاء سے منوالیا اور اُن کی مساعی کا اصل حاصل یہ برآمد ہوا کہ ' تدبّرِ قرآن ' کا صحیح منہج واضح ہوگیا اور قرآن حکیم کے معدنِ علم و حکمت سے معرفت کے ہیرے جواہرات نکالنے کا صحیح طریق معیّن ہوگیا۔

مولانا فراہیؒ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و احسان یہ ہوا کہ انہیں ایسے شاگرد بھی میسّر آگئے جنہیں انہوں نے اپنے طرز پر غور و فکر کی تربیت خود دے کر تیار کر دیا تاکہ وہ اُن کے بعد ان کی روشن کی ہوئی راہ پر آگے بڑھ سکیں۔ اُن کے اِن تلامذہ میں سب سے نمایاں مقام تو حاصل ہے مولانا امین احسن اصلاحی کو جنہوں نے نہ صرف یہ کہ حقیقتِ شرک، حقیقتِ توحید، حقیقتِ تقویٰ اور حقیقتِ نماز ایسی گرانمایہ تصانیف کے ذریعے خالص قرآنی علم کلام کی تدوین کی راہ کھول دی (مولانا کی یہ چاروں تصانیف اب یکجا ' حقیقتِ دین ' کے نام سے مطبوعہ موجود ہیں) بلکہ، خواہ عمر کے آخری حصے میں سہی، اپنے استاذ کے اُصول پر باقاعدہ تفسیر ' تدبّرِ قرآن ' بھی تحریر کر دی (جو اب بحمد اللہ تکمیل کو پہنچنے ہی والی ہے) اور دوسرے نمبر پر ہیں مولانا صدر الدین اصلاحی جو بھارت ہی میں مقیم ہیں۔

بے لگام اور مادر پدر آزاد متجدّدین اور روایت پرست و قدامت پسند علماء کے بَین بَین ' فکرِ قرآنی ' کے یہ تین دھارے جو برّصغیر پاک و ہند کے محیطِ علمی میں بہہ رہے ہیں بظاہر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے جذب و انجذاب کا شدید میلان رکھتے ہیں۔

ان میں سے مؤخر الذکر دو دھارے تو درحقیقت پھوٹے ہی ایک عظیم اور گھمبیر شخصیّت سے ہیں جس نے دیوبند اور علی گڑھ کے مابین ایک درمیانی راہ نکالنے کی غرض ہی سے ندوۃ العلماءؒ لکھنؤ میں ڈیرہ لگایا تھا۔ ہماری مراد علّامہ شبلی نعمانی مرحوم سے ہے جنھیں مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم دونوں کے مُربّی کی حیثیّت حاصل ہے ——————— ہم نے اب سے لگ بھگ آٹھ سال قبل ایک مفصّل مضمون ان ہی صفحات میں تحریر کیا تھا جس میں علّامہ شبلیؒ، مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم کے ذاتی میلانات اور علمی و فکری رجحانات کا جائزہ لیا گیا تھا، جس کی

تصویب مولانا عبدالماجد دریا بادی نے، جنھیں بلاشبہ اس قافلے کے آخری مسافر کی حیثیت حاصل ہے، ان الفاظ میں کی تھی :

"........ حیرت ہوگئی، شبلی، فراہی، ابوالکلام تینوں کی یہ نباضی بُعدِ زمانی اور بُعدِ مکانی دونوں کے باوجود اتنی صحیح کیوں کر کرلی ! ؎

درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید ! ......"

اس تحریر کا حسبِ ذیل اقتباس طوالت کے باوصف، ان شاء اللہ، قارئین پر گراں نہ گذرے گا :

"مولانا شبلیؒ اپنی ذات میں ایک نہایت جامع الصفات انسان تھے اور ان کی شخصیت ندوہ کی نسبت بہت زیادہ جامع اور گمبھیر تھی۔ چنانچہ وہ بیک وقت علم و فضل، فلسفہ و کلام، شعروادب اور ملّی و قومی سیاست حتّٰی کہ رندی اور رنگینی سب کے جامع تھے۔ اُن کے اصل جانشین سیّد سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت میں مولانا شبلی کی ہمہ گیر شخصیت کے صرف چند ہی پہلوؤں کا تسلسل قائم رہ سکا۔ لیکن ان کے زیرِ اثر دو اور ہستیاں ایسی پروان چڑھیں جو اُن کی بعض صفات کی وارث بنیں اور جن میں مولانا شبلیؒ کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلو اُجاگر ہوئے۔ ہماری مراد مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ہے۔ یہ دونوں حضرات براہِ راست تو ندوی نہیں لیکن ان کی تربیت میں مولانا کا بڑا حصّہ ہے ـــــ اور چونکہ برِّ صغیر کی حالیہ مذہبی فکر کے میدان میں علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین دو اہم علمی و فکری سوتے ان ہستیوں کی بدولت پھوٹے ہیں لہٰذا ان کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔

مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم میں متعدد اُمور بطورِ قدرِ مشترک بھی ہیں مثلاً ایک یہ کہ دونوں کی تربیت میں مولانا شبلی کا حصّہ تھا، دوسرے یہ کہ دونوں کو قرآنِ حکیم سے خاص شغف تھا۔ تیسرے یہ کہ دونوں اپنے وقت کے انتہائی وضع دار انسان تھے۔ چوتھے یہ کہ دونوں (مولانا شبلیؒ کے بالکل برعکس ـــــ جنھوں نے اپنی 'حنفیّت' کی شدّت کے اظہار کے لیے 'نعمانی' کی نسبت

کو اپنے نام کا مستقل جزو بنا لیا تھا) تقلید سے یکساں بعید و بیزار تھے اور دونوں کو اصلاً ذہنی و علمی مناسبت امام ابنِ تیمیہؒ سے تھی۔ لیکن ان اشتراکات کے بعد اختلافات کا ایک وسیع میدان ہے جس میں یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد تھیں۔ مولانا آزاد میں شبلی کی رندی و رنگینی کا تسلسل بھی موجود رہا جب کہ مولانا فراہیؒ بالکل زاہد خشک تھے۔ مولانا آزاد کی دینداری میں شکوہ و تمکنت کی آمیزش تھی جبکہ مولانا فراہیؒ پر فقر و درویشی کا رنگ غالب تھا۔ مولانا آزاد "ابو الکلام" تھے اور اُن کی شعلہ بیانی خطابت میں ایک لاوا اگلنے والے زندہ آتش فشاں کا رنگ تھا۔ جبکہ مولانا فراہی نہایت کم گو تھے اور ان کا سکوت ایک ایسے خاموش آتش فشاں سے مشابہت رکھتا تھا جس کے باطن میں تو خیالات و احساسات کا لاوا جوش مارتا ہو لیکن ظاہر میں وہ بالکل ساکت و صامت ہو۔ مولانا آزاد کی تحریر میں اصل زور عربیّت اور عبارت آرائی پر تھا جبکہ مولانا فراہی کی تحریر نہایت سادہ لیکن مُدلّل ہوتی تھی۔ مولانا آزاد سیاست کے میدان کے بھی شہسوار تھے اور دین کی وادی میں بھی اُن کا اصل مقام داعی کا تھا جبکہ مولانا فراہی سیاست سے تمام عمر کنارہ کش رہے اور دین و مذہب کے میدان میں بھی ان کا اصل مقام آخر دم تک صرف ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکّر کا رہا ـــــ چنانچہ مولانا آزاد طوطیٔ ہند تو تھے ہی، ایک وقت ایسا بھی گزرا جب وہ 'امامُ الہند' قرار پائے جبکہ مولانا فراہی سے اُن کی زندگی میں بھی اور آج تک صرف کچھ علم دوست لوگ ہی واقف ہو سکے ـــــ لیکن اس کے برعکس مولانا آزاد تو آندھی کی مانند اُٹھے اور بگولے کی طرح رخصت ہو گئے تا آنکہ آج وہ لوگ بھی اُن کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جنھوں نے اپنی قندیل خود ان ہی کی شمع سے روشن کی جبکہ مولانا فراہی ایک مستقل طرزِ فکر، اور مکتبِ علمی کی بنیاد رکھ گئے۔ جن کا نام لیوا ایک ادارہ "دائرۂ حمیدیہ" کے نام سے ہندوستان میں اور ایک انجمن مولانا امین احسن اصلاحی کی ذات میں پاکستان میں موجود ہے۔

قرآن مجید سے جو شغف ان دونوں بزرگوں کو تھا، مزاج کے افتاد کے فرق کی بنا پر اس کا ظہور بھی مختلف صورتوں میں ہوا۔ مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ اردو ادب کا تو شاہکار (CLASSIC) ہے ہی، قرآن کے جلال و جمال کا بھی ایک حسین مرقّع ہے۔ پھر سورۂ کہف کے بعض مباحث میں اُن کی تحقیق و تدقیق کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ بایں ہمہ قرآن حکیم کا کوئی مرتّب و منضبط فکر وہ پیش نہیں کر سکے جبکہ مولانا فراہیؒ نے قرآن حکیم کے استدلالی پہلو کو واضح کیا اور ایک طرف نظمِ قرآن کی اہمیت واضح کر کے تدبّرِ قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن پر غور و فکر کے اُصول و قواعد از سرِ نو مرتّب و مدوّن کئے اور دوسری طرف اپنی بعض تصنیفات میں (جو تا حال مسوّدات ہی کی صورت میں ہیں) خالصتاً قرآن حکیم کی روشنی میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد رکھ دی ۔۔۔۔"

قصّہ مختصر ۔۔۔۔ علّامہ شبلی نعمانیؒ، امام حمید الدّین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مابین قُرب و یگانگت کا یہی رشتہ تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے معنوی خلیفہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے "قیامِ حکومتِ الٰہیہ" کے نصب العین کے پیشِ نظر "جماعتِ اسلامی" کی تاسیس کی تو ان کی دعوت پر نہ صرف یہ کہ مولانا فراہیؒ کے تمام نمایاں شاگرد بشمول مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، اور مولانا صدر الدّین اصلاحی لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو گئے بلکہ مولانا شبلیؒ کے تلمیذِ رشید مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کے دو ارشد تلامذہ یعنی مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندویؒ بھی ۔۔۔۔ "من نیز حاضر می شوم ۔۔۔۔" کے مصداق بن گئے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس "قِران السعدین" سے بہت سی برکتیں ظہور میں آئیں جن کا نمایاں ترین مظہر مولانا امین احسن اصلاحی کی شاہکار تالیف "دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار" ہے جس میں ایک جانب مولانا فراہیؒ کے قرآنی غور و فکر کا تعمّق موجود ہے تو دوسری جانب مولانا آزاد مرحوم کا داعیانہ جوش و خروش بھی موجود ہے۔ اور اسی کے ذیل میں آتی ہیں مولانا صدر الدّین اصلاحی کی بعض تصانیف جیسے "فریضۂ اقامتِ دین" ۔۔۔۔ "حقیقتِ نفاق" ۔۔۔۔ اور "اساسِ دین کی تعمیر" وغیرہ۔

رہا 'فکرِ قرآنی' کا اوّل الذّکر دھارا جس میں علّامہ اقبال مرحوم کو تن تنہا ایک انجمن کی حیثیت حاصل ہے تو اس کا بقیّہ دونوں دھاروں سے ربط و تعلّق اس واقعے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن کی بنجر اور سنگلاخ زمین سے ہجرت کر کے پنجاب ایسے زرخیز اور سرسبز و شاداب خطّے میں اقامت گزیں ہونے کی دعوت علّامہ اقبال مرحوم ہی نے دی تھی - اور اس سے بھی آگے یہ کہ معروف علماء کے حلقے میں علّامہ مرحوم کے سب سے بڑے بلکہ غالباً صحیح تر الفاظ میں واحد شیدائی مولانا ابوالحسن علی ندوی ہی ہیں -

مزید بر آں، پنجاب میں مولانا مودودی کو جو مقبولیّت حاصل ہوئی اور ان کی دعوت اور جماعت دونوں کو جو فروغ نصیب ہوا، بعض دوسرے اسباب و عوامل کے ساتھ ساتھ اس کا اہم ترین سبب یہی ہے کہ یہاں علّامہ اقبال مرحوم اپنے اشعار کے ذریعے گویا قلوب کی دنیا میں ہل چلا چکے تھے اور اب زمین منتظر تھی کہ کوئی آئے اور بیج ڈالے اور یہ اپنے خزانے اُگل کر رکھ دے - خصوصاً پنجاب کا جدید تعلیم یافتہ نوجوان تو گویا اس "دگر دانائے راز" کیلئے چشم براہ تھا جس کا ذکر بہ شدید حسرت و یاس علّامہ مرحوم نے مرتے دم کیا تھا !

شاہ ولی اللہ دہلوی کی قرآنی خدمات

کے موضوع پر

شیخ محمد اکرام کی تالیف 'رودِ کوثر'

سے ایک اقتباس صفحہ ۷۶ پر ملاحظہ فرمائیں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کا مؤسس اور

- اس کے فہم قرآن کے ابعادِ اربعہ
- اُن سلاسلِ اربعہ کے اعاظمِ رجال سے اُس کے روابط ـــــ اور
- دو اہم شخصیتوں سے وصل و فصل کی داستان ـــــ

اِن سُطور کے ناکارہ و ناچیز راقم کو اپنی اس خوش بختی پر ناز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بیے نوجوانی ہی کے دَور میں ایسے مواقع پیدا فرما دیئے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی بساط کے مطابق 'فکرِ قرآنی' کے متذکرہ بالا تینوں درمیانی دھاروں سے متعارف و مستفید ہوا بلکہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیّر احمد عثمانیؒ کے حواشی کی وساطت سے اس کا ذہنی رشتہ کم از کم تفسیرِ قرآن کی حد تک ان علماءِ ربّانیّین کے حلقے سے بھی قائم ہو گیا جو بلا شبہ "الرَّاسِخُون فی العلم" کہلانے کے مستحق ہیں ——— نتیجتہً بفضل اللہ و عونہٖ اس کی ذات میں بقدرِ وسعتِ ظرف ان 'انہارِ ثلثہ' کے ساتھ ساتھ یہ چوتھا 'چشمۂ صافی' بھی رواں دواں ہے ——— فللہ الحمد و المنّۃ'۔

جذباتی سطح پر راقم کی شخصیت پر سب سے پہلی اور سب سے گہری چھاپ علامّہ اقبال مرحوم کے اردو کلام کی ہے۔ چنانچہ ہائی اسکول کا پورا زمانۂ طالب علمی (۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء) احقر نے بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کے اشعار پڑھتے اور گنگناتے ہوئے بسر کیا۔ جس سے ایک جذبۂ ملّی اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور چونکہ اس وقت اس جذبے کے مظہرِ اتمّ کی حیثیّت تحریک پاکستان کو حاصل تھی لہٰذا اس دَور میں اپنی بساط کے مطابق عملی وابستگی تحریکِ مسلم لیگ کی تنظیم طلبہ یعنی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ رہی ——— تاہم اسی دَور کے اواخر میں راقم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے بھی متعارف ہو چکا تھا اور 'الہلال' اور 'البلاغ' والے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے بھی ——— مولانا مودودی کی تحریروں میں سے یوں تو جو کچھ بھی اس وقت پڑھنے میں آیا بھلا ہی لگا لیکن الحمد للہ کہ ان کے ساتھ راقم کا اصل ذہنی و قلبی رشتہ 'تفہیم القرآن' کے ذریعے قائم ہوا جس کے ضمن میں تقسیم ہند کے قریب کے زمانے میں ماہنامہ 'ترجمان القرآن' میں تفسیر سورۂ یوسف شائع ہو رہی تھی۔ اس ذہنی و قلبی تعلق کی گھمبیری کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ تقسیمِ ملک

سے ہنگاموں اور آگ اور خون کی وادیوں سے گذر کر جیسے ہی پاکستان پہنچنا نصیب ہوا راقم ان کی تحریک سے وابستہ ہوگیا اور ایک جانب تو اس نے چند ماہ کے اندر اندر ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اس طور سے پڑھ ڈالا کہ مولانا محمد اسمٰعیل گوجرانوالویؒ کے الفاظ میں نہ صرف یہ کہ ان کی تصانیف کا "فارغ التحصیل" ہوگیا بلکہ ان کا 'مدرّس' بھی بن گیا۔ اور دوسری طرف زمانۂ طالب علمی کے بقیہ سات سال (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء) ان کی تحریکِ اسلامی کے نذر کر دیئے اور اپنی بیشتر قوتیں اور توانائیاں اسلامی جمعیتِ طلبہ کے ساتھ عملی وابستگی میں کھپا دیں ——— اس دور کے تقریباً وسط میں (۵۰-۱۹۵۱ء کے لگ بھگ) راقم کا ذہنی رابطہ مولانا امین احسن اصلاحی سے قائم ہوا۔ مولانا کی تحریروں کے بارے میں جماعتِ اسلامی کے حلقوں میں عام طور پر یہ مشہور تھا کہ وہ ثقیل بھی ہوتی ہیں اور خشک بھی، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جو قلبی انس راقم کو اس وقت تک قرآن مجید کے ساتھ حاصل ہو چکا تھا اس کی بنا پر اسے ان تحریروں میں نہ ثقل کا احساس ہوا نہ خشکی کا۔ مولانا کی تحریریں بھی یوں تو راقم نے سب ہی پڑھ ڈالیں لیکن ان کی دو تصانیف سے تو اسے عشق کی حد تک لگاؤ ہوگیا: ایک 'دعوتِ دین اور اُس کا طریقِ کار' اور دوسری 'تدبّرِ قرآن' (جواب 'مبادیٔ تدبّرِ قرآن' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے)۔ مولانا کی ان تصانیف کے مطالعے سے بلاشائبہ ریب و شک راقم کے قرآن حکیم کے ساتھ ذہنی تعلق میں ایک نئے بُعد و عرض (DIMENSION) کا اضافہ ہوا اور پھر جب ۱۹۵۴ء کے لگ بھگ مولانا کا ترجمہ کردہ مجموعۂ تفاسیرِ فراہی شائع ہوا تب تو راقم کو تفسیرِ قرآن کے اس مکتبِ فکر کے اصل منبع و سرچشمہ تک رسائی حاصل ہوگئی فللّٰہ الحمد ——— اسی زمانۂ طالب علمی کے دوران احقر حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی سے متعارف ہوا (یاد ہوگا، اس کا ایک نہایت اعلیٰ اور حسین و جمیل ایڈیشن کراچی کے بعض اہلِ خیر نے ہانگ کانگ سے طبع کرا کے مفت تقسیم کیا تھا جو بعد میں فی نسخہ پانچ روپے سے لے کر تیس روپے تک میں فروخت بھی ہوتا رہا!)۔ مولانا عثمانیؒ کے بظاہر حد درجہ سادہ و سلیس حواشی میں راقم کو فکر و نظر کی جو گہرائی اور گیرائی نظر آئی اور خصوصاً احوالِ باطنی کی جو چاشنی یا بالفاظِ دیگر تصوّف کی جو حلاوت محسوس ہوئی

اس سے اس کی نسبت قرآنی، کو بفضل اللہ تعالیٰ و عونہٖ عرضِ ثالث (THIRD DIMENSION) عطا ہوگیا ——— اور ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ زمانۂ طالبعلمی ہی میں اس عاجز و ناکارہ کو نہ صرف یہ کہ قرآن حکیم کے ساتھ ایک اُنسِ قلبی عطا ہوگیا اور مناسبت ذہنی حاصل ہوگئی بلکہ ایک نسبتِ روحانی بھی نصیب ہوگئی اور اس کے پڑھنے اور پڑھانے (تعلیم و تعلّم) کا ایک شدید داعیہ بھی اس کے باطن میں پیدا ہوگیا چنانچہ اوّلاً جمعیتِ طلبہ کے حلقوں میں اور پھر جماعتِ اسلامی کے ساہیوال اور اوکاڑہ کے حلقے میں اس کے 'درسِ قرآن' کا چرچا ہوگیا۔ اور اس کے بارے میں بالعموم ایک خوشگوار حیرت (PLEASANT SURPRISE) کا سا تأثر ظاہر کیا جانے لگا ——— دورِ طالب علمی کے اختتام کے تقریباً معاً بعد راقم کا تعارف ایک تو ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم سے ان کی تالیف 'قرآن اور علمِ جدید' کی وساطت سے ہوا اور دوسرے ایک بالکل 'دوسرے' علّامہ اقبال سے ان کے خطبات (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) کے حوالے سے۔ اور راقم کو اس اعتراف میں ہرگز کوئی باک نہیں کہ اس سے اس کے مطالعۂ قرآن کو وہ بُعدِ رابع (FOURTH DIMENSION) ملا جس کی اہمیت زمانۂ حال کے اعتبار سے پہلے تینوں اعراض و ابعاد سے کسی طرح کم نہیں ——— اب خواہ اسے کوئی باندازِ تحقیر راقم کے مطالعۂ قرآن کا 'حدودِ اربعہ' کہہ لے خواہ بطرزِ استہزا اسے اس کا 'مبلغِ علم' قرار دے لے، بہرحال واقعہ یہی ہے کہ راقم کی قرآنی 'سوچ' کا اصل تانا بانا ان ہی 'ابعادِ اربعہ' سے تیار ہوا ہے جن کی محکم اور پختہ اساسات ۶۲-۱۹۶۱ء کے آس پاس قائم ہو چکی تھیں جبکہ راقم کی عمر کُل تیس برس کے لگ بھگ تھی ———

بعد کے چودہ پندرہ سالوں کے دوران اللہ کا فضل و کرم ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان اساسات میں سے کوئی بھی منہدم تو کجا مضمحل یا شکستہ تک نہیں ہوئی بلکہ بحمد اللہ چاروں ہی کو مسلسل تقویت ملتی رہی اور استحکام حاصل ہوتا رہا۔ اور بجائے اس کے کہ : ع

"جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا!"

کے مصداق کسی نئے زاویۂ فکر سے متعارف ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ پچھلی محنت اکارت ہوتی اور اس سے حاصل

شدہ نتائج بالکل زائل ہو جاتے ۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہر نیا اندازِ فکر سابق فکر میں ایک ارتقائی شان پیدا کرتا چلا گیا۔ اور یہ عمارت اپنے اطراف و جوانب سمیت بلند ہوتی گئی — اس ہمہ جہتی استحکام و ارتقاء کے ضمن میں واقعہ یہ ہے راقم سب سے بڑھ کر مرہونِ منت ہے، علامہ اقبال مرحوم کے فارسی کلام کا۔ جس کے اعتبار سے علامہ موصوف یقیناً 'رومی ثانی' بھی ہیں اور مجسّم 'ترجمان القرآن' بھی۔ اور اس سلسلے میں شدید ناانصافی ہو گی اگر ذکر نہ کر دیا جائے کہ ابتدائی پانچ سالوں کے دوران راقم کو فائدہ پہنچا مولانا برکات احمد خاں مرحوم (ٹونکی ثم ساہیوالی) کی ہم نشینی سے اور لبعد کے دس سالوں کے دوران فیض حاصل ہوا پروفیسر یوسف سلیم چشتی مدظلہٗ کی صحبت سے۔

الغرض ——— راقم کے فکر و نظر پر "ھُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ" کے مصداق ابتدائی اور تکمیلی چھاپ تو ہے علامہ اقبال مرحوم کی ——— ان میں سے ابتدائی تاثر زیادہ تر جذباتی ہے جس کا حاصل ہے 'جذبۂ ملّی' اور تکمیلی رنگ خالص فکری ہے جس کا موضوع ہے فکرِ جدید کے پس منظر میں قرآن حکیم کا مطالعہ یا قرآنِ حکیم کی روشنی میں فکرِ جدید کا جائزہ و تجزیہ ——— اور ان کے مابین رواں ہیں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی 'قرآنی دعوتِ جہاد و انقلاب' اور امام حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کے 'طریق تدبّرِ قرآن' اور حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے 'علمِ راسخ' کے کوثر و تسنیم ایسے چشمے ——— ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ۔ راقم حیران ہے کہ کس منہ سے اور کن الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کرے۔ ایک ان پڑھ یا نیم خواندہ انسان پر جسے اپنی نسبت 'اُمّیّت' پر فخر ہے انعامات و اکرامات کی یہ بارش! بقول ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم ؎ "اک بندۂ عاصی کی اور اتنی مدارائیں!"

کے اعاظم رجال اور "السابقون الاوّلون" کی اکثریت کا انتقال تو راقم الحروف کی پیدائش یا شعور کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہو چکا تھا لہٰذا ان کی زیارت سے تو محرومی ہی رہی۔ البتہ ان کے "مُتَّبِعِینَ بِاِحْسَانٍ" کی اکثریت کے ساتھ قریبی تعلق بلکہ ذاتی و نجی روابط کی سعادت اس عاجز کو حاصل رہی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال راقم کی پیدائش سے لگ بھگ بارہ ۱۲ سال قبل ہو چکا تھا اور ان کے ساتھ راقم کا ذہنی و قلبی رشتہ کُل کا کُل غائبانہ ہے۔ بایں ہمہ ان کی عظمت کے جو نقوش اس عاجز کے قلب پر کندہ ہیں اُن کو الفاظ کا جامہ پہنانا نہایت مشکل نظر آتا ہے مختصر یہ کہ راقم کو امامُ الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جامعیت کبریٰ کا عکسِ کامل اُن کی شخصیت میں نظر آتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ امامُ الہند کی جامعیت کا مظہر ان کی تصانیف ہیں اور شیخ الہندؒ کی جامعیت کا ظہور ان کے تلامذہ میں ہوا۔ اگر یہ اُصول درست ہے اور لازماً درست ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو ذرا پہچاننے کی کوشش کیجئے اس شخص کی عظمت کو جس کا جانشین جہادِ حُرّیت اور تحریکِ استخلاصِ وطن کے میدان میں ہوا مولانا حسین احمد مدنیؒ ایسا مجاہدِ اعظم۔ اور حدیث، فقہ، اُصول اور کلام کے میدان میں ہوا مولانا سیّد انور شاہ کاشمیریؒ ایسا نابغۂ روزگار انسان۔ اور جس کے فہم قرآن اور جذبۂ ملّی کا ظہور ہوا مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسی عظیم شخصیت میں اور جس کے انقلابی کردار نے روپ دھارا مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم ایسے سیماب وش انسان کا راقم کا ذاتی احساس یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کو ان کے اپنے حلقے کے لوگوں نے بھی کما حقہٗ نہیں پہچانا ——— ورنہ ذرا غور کیا جائے تو اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ چودھویں صدی ہجری کے مُجدّد وہ ہیں! ——— واللہ اعلم!

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا انتقال تو اگرچہ راقم کے سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد ہوا لیکن افسوس کہ ان کی زیارت سے بھی محرومی ہی رہی۔ تاہم ایک خیال اطمینانِ قلب کا موجب بنتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ذرّے کو آفتاب سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو اس عاجز کو بھی ان کے ساتھ ایک نسبتِ معنوی حاصل ہے۔ بایں طور کہ جب وہ تحریکِ پاکستان کے مرحلۂ اوّل

کے قائد کی حیثیت سے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کر رہے تھے تو یہ خاکسار بھی خواہ ایک طفلِ مکتب کی حیثیت ہی سے سہی مشرقی پنجاب کے ایک ضلع (حصار) کے مختلف قصبات (سرسہ، ہانسی وغیرہ) کے ہائی اسکول کے طلبہ کے مابین ایک رابطہ استوار کرنے کی سعی میں مشغول تھا ——— بعدازاں ان کے تفسیری حواشی کی بدولت ان کی جو معنوی صحبت حاصل رہی اس کا ذکر اوپر ہو ہی چکا ہے۔

مولانا عثمانیؒ کے رفیقِ کار اور معتمدِ خاص مولانا مفتی محمد شفیعؒ سے ملاقات کا شرف البتہ راقم کو حاصل رہا اور ان کی شفقت و محبت سے بھی اس عاجز نے حصہ پایا۔ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے شاگردِ رشید مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی نیازمندی کی سعادت بھی راقم کو حاصل ہے اور اُن کی شفقت اور نظرِ کرم بھی اس ناچیز کا سرمایۂ افتخار ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے فیض کے دوسرے دو چشموں سے بھی راقم بحمداللہ بیگانہ و نابلد نہیں۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مولانا سیّد حامد میاں مدظلہٗ اور مولانا سندھی مرحوم کے شاگردِ رشید مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خلفُ الرّشید مولانا عبیداللہ انور کی نیازمندی، اور گاہے گاہے اُن کی خدمت میں حاضری کا شرف بھی راقم کو حاصل ہے، گویا ؎

اُحِبُّ الصَّالِحِیْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ لَعَلَّ اللّٰهَ یَرْزُقُنِیْ صَلَاحًا

علامہ اقبال کے انتقال کے وقت بھی راقم کی عمر کُل چھ برس تھی لیکن اب یہ بات خود اس عاجز کو نہایت عجیب اور حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ اُن کے انتقال کو راقم نے ایک ذاتی صدمے کی حیثیت سے محسوس کیا تھا۔ اِس کی ایک ہی توجیہ ممکن ہے اور وہ اس حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں کہ اِس عالمِ فانی میں آنے سے قبل عالمِ ارواح میں جن ارواح کے مابین اُنس پیدا ہو جاتا ہے اُن کے مابین مودّت کا رشتہ اس عالمِ اجساد میں بھی برقرار رہتا ہے ——— بہرحال علامہ مرحوم کے ساتھ راقم کا قلبی تعلّق کم و بیش "مِنَ الْمَهْدِ اِلَی اللَّحْدِ" والا ہے۔ اور اوپر عرض کیا ہی جا چکا ہے کہ راقم کے شعور کی تحتانی

سطحوں میں سے سب سے نچلی تہہ پر نقوش ثبت ہیں علّامہ مرحوم کے اُردو اشعار کے اور اس کے فکر کی بلند ترین سطح پر کندہ ہیں نقوش اُن کے فارسی کلام کے۔

یہی وجہ ہے کہ جب راقم کی ملاقات فلسفۂ اقبال کے مُدوّن و شارح، اور 'حکمتِ اقبال' کے مصنّف ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم سے ہوئی تو دونوں ہی نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے سے بہت پہلے سے واقف ہیں۔ اور جب بھی کوئی گفتگو ہوئی یہی محسوس ہوا کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک تقریباً ڈھائی سال نہایت قریبی تعلّق راقم کو ڈاکٹر صاحب مرحوم سے حاصل رہا۔ ('میثاق' کے اس دَور کے فائل اس پر شاہدِ عادل ہیں!) اُس زمانے میں "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" راقم کے قلم سے نکل کر شائع ہو چکا تھا۔ اس کی حرف بحرف تصویب ڈاکٹر صاحب نے فرمائی اور 'میثاق' کے لیے اپنی تصنیف 'MANIFESTO OF ISLAM' کا ترجمہ اُردو میں خود ہی کرنا شروع کر دیا جس کی چند ہی قسطیں چھپنے پائی تھیں کہ ؎

"آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"

والا معاملہ ہو گیا۔ یغفر اللہ لنا و لہٗ و یدخلہ فی رحمتہٖ ۔

اسی طرح کلامِ اقبال کے شارح پروفیسر یُوسف سلیم چشتی مدّ ظلّہٗ سے جو ذاتی ربط و تعلّق ۱۹۶۷ء میں اُستوار ہوا تھا وہ بحمد اللہ نہ صرف یہ کہ آج تک قائم ہے بلکہ اُمّید واثق ہے کہ آخر دم تک دائم رہے گا۔ (یہاں تک کہ بعض واقفینِ حال تو واقعتہً حیرت میں ہیں کہ پروفیسر صاحب ایسے نازک طبع اور زُود رنج مزاج بزرگ سے راقم کا تعلّق کیسے نبھ رہا ہے!) پروفیسر صاحب نے "نشأۃِ ثانیہ" کی جو مفصّل تائید و تحسین تحریر کی تھی وہ تو اکثر قارئینِ 'میثاق' کے علم میں ہے ہی زبانی جو کچھ فرمایا اسے اس خوف سے نقل نہیں کر سکتا کہ اسے خود ستائی پر محمول کیا جائے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ویسے تو ۱۹۵۸ء میں ہوا - لیکن راقم کو جس ابوالکلام سے دلچسپی تھی یا ہے یعنی 'الہلال' اور 'البلاغ' والا ابوالکلام جس کے بارے میں کمالِ وسعتِ ظرف کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا تھا حضرت شیخ الہندؒ نے کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا" وہ واقعتہً ۲۱-۱۹۲۲ء کے لگ بھگ ہی وفات پا چکا تھا اور اس کے معنوی خلیفہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جب اس کے ترک کردہ مشن کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا تو اُسے بجا طور پر اس کی زندگی ہی میں 'مرحوم' قرار دے دیا تھا ——— تاہم مولانا مرحوم کو دیکھنے کی تمنا راقم کے دل میں مستقل طور پر رہی جسے دو ملکوں کے فاصلے نے بالآخر ۱۹۵۸ء میں حسرت میں تبدیل کر دیا-

عجیب اتفاق ہے کہ جس سال مولانا مودودی نے مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر کے ہم نام ماہنامے 'ترجمان القرآن' کی ادارت سنبھالی وہی راقم کا سنِ پیدائش ہے - اور مولانا آزاد کے انتقال کا زمانہ لگ بھگ وہی ہے جب کم و بیش دس سال کی ہم سفری کے بعد راقم کی راہ مولانا مودودی کے راستے سے جدا ہوئی-

مولانا مودودی کے ساتھ راقم کے وصل و فصل کی داستان نہایت طویل ہے مختصر یہ کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک نہایت قریبی تعلق راقم کو مولانا کے ساتھ حاصل رہا ان میں سے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک کے دو سالوں کے دوران جبکہ راقم اسلامی جمعیت طلبہ کے صفِ اوّل کے کارکنوں میں سے تھا، مولانا سے قرب کا یہ عالم تھا کہ راقم جب چاہتا تھا مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا- یہاں تک کہ بعض مواقع پر فوری مشورے کے لیے راقم الحروف نے مولانا سے نصف شب کے لگ بھگ اُن کی خوابگاہ میں بھی ملاقات کی- ۱۹۵۵ء میں راقم جماعتِ اسلامی کا رکن بنا اور بدقسمتی سے اس سے فوراً بعد ہی اس نے شدت کے ساتھ محسوس کر لیا کہ جماعتِ اسلامی کی تحریک اپنی اصل اساسات سے منحرف ہو چکی ہے - اواخر ۱۹۵۶ء میں راقم نے اپنا وہ مفصل بیان سپردِ قلم کیا جو اب 'تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے، فروری ۱۹۵۷ء میں اجتماعِ ماچھی گوٹھ میں راقم نے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی ناکام کوشش کی-

اور حالات کی ستم ظریفی نے اس وقت صورت کچھ ایسی پیدا کر دی کہ گویا مودودی صاحب 'لیڈر آف دی ہاؤس' تھے اور یہ خاکسار 'لیڈر آف دی اپوزیشن'! چنانچہ راؤ خورشید علی خاں صاحب نے جو اس زمانے میں جماعتِ اسلامی کے قائدین میں سے تھے اور اب پیپلز پارٹی کے رُکن اور نیشنل اسمبلی کے ممبر ہیں، بھرے اجلاس میں باقاعدہ یہ الفاظ کہے بھی تھے کہ "ڈاکٹر اسرار کو لیڈر آف دی اپوزیشن کی حیثیت حاصل ہے انہیں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے پورا وقت ملنا چاہیئے!" ——— بہرنوع اپریل ۱۹۵۷ء میں راقم نے جماعت کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اس طرح وہ دس سالہ تعلق ختم ہو گیا ——— اب اس فصل کو بھی بیس ۲۰ برس ہونے کو آئے ہیں، اور اس دوران میں بھی اُونچ نیچ کے بہت سے ادوار آئے لیکن ان سب کا حاصل یہ ہے کہ ؎

بس اتنا سا تعلق اب اُن سے رہ گیا ہے وہ مجھ کو جانتے ہیں، میں اُن کو جانتا ہوں

آج سے تقریباً دس سال قبل جب رحیم یار خاں میں جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے چند حضرات کے اجتماع میں "ایک نئی اسلامی تنظیم" کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ راقم نے بعض معروضات 'میثاق' کے صفحات میں مولانا مودودی کی خدمت میں پیش کی تھیں ——— راقم کے احساسات اب بھی بالکل وہی ہیں اور اب جبکہ 'تنظیمِ اسلامی' کے نام سے ایک چھوٹا سا قافلہ دوبارہ تشکیل پا کر سفر کا آغاز کر چکا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان معروضات کو من و عن دہرا دیا جائے ——— وَھُوَ ھٰذَا :

"اس موقع پر بالکل ذاتی حیثیت میں ایک گذارش راقم الحروف جماعتِ اسلامی کے بزرگوں خصوصاً مولانا مودودی کی خدمت میں کرنا چاہتا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ دو سال کے دوران، راقم الحروف کے بعض اقدامات اور اس کی بعض تحریروں سے یقیناً آپ کو شدید تکلیف پہنچی ہو گی۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ دل کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی ان میں سے کسی اقدام یا تحریر سے آپ کی دل آزاری ہرگز مقصود نہ تھی۔ راقم الحروف کے دل میں اظہارِ دینِ حق اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا جذبہ آپ ہی کی تحریروں سے پیدا ہوا۔ اسی جذبے سے سرشار ہو کر طالب علمی کے قیمتی اوقات اور عمرِ عزیز کے بہترین لمحات آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر جدوجہد

کی نذر کئے۔ پھر جب محسوس ہوا کہ آپ غلط رُخ پر چل نکلے ہیں تو ایک بیان کی صورت میں اپنے خیالات کو قلم بند کیا اور آپ سے درخواست کی کہ: "اپنی تو کوئی ایسی خدمت نہیں ہے جس کا واسطہ دے سکوں، آپ ہی کی شفقتیں اور عنایتیں ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے اس بیان کو پڑھ ضرور لیں"۔۔۔۔۔ ماچھی گوٹھ کے بھرے اجتماع میں سٹیج پر اعلان کیا کہ: "اگرچہ مجھے اپنے مؤقف کی صحت کا یقین ہے اور امیرِ جماعت کی طویل تقریر میں مجھے کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ تاہم مَیں جماعت میں شامل رہوں گا اس لیے کہ اس کے بغیر مَیں اپنے وجود کا تصور بھی نہیں کر سکتا"۔ لیکن پھر جب کچھ آپ کی عنایتوں میں مزید اضافہ ہوا اور آپ نے اہلِ اختلاف پر ضعفِ ارادۂ بسیط اور ضعفِ ارادۂ مرکّب کی پھبتیاں چست کرنی شروع کیں اور کچھ یہ محسوس ہوا کہ جماعت میں عضوِ معطّل کی حیثیّت سے رہنا آخر چہ سود؟ تو یہ کہتے ہوئے ایک بھاری دل کے ساتھ جماعت سے علیٰحدگی اختیار کر لی کہ: مَیں جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے حقیقی محبّت کا تعلّق رکھتے ہیں۔ جب میں سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبوراً اس لیے آمادہ ہو گیا کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا"! علیٰحدہ ہونے کے بعد بھی کم و بیش پانچ سال تک شدید اختلاف کے باوجود آپ کے ساتھ وہی قلبی تعلّق قائم رہا جو ایک احسان مند کا اپنے محسن سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں حجّ کے لیے روانہ ہونے سے قبل آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اس قلبی کیفیّت کا اظہار بھی کیا تھا۔ افسوس کہ اس کے فوراً بعد آپ کے دو اقدامات یعنی ایک غلافِ کعبہ کے سوانگ اور دوسرے سہروردی مرحوم سے ربط و تعلّق کی بدولت دل کی یہ کیفیّت برقرار نہ رہ سکی اور ذہنی دوری کے ساتھ ساتھ ایک ایسا قلبی بُعد بھی قائم ہو گیا جس میں رنج کے ساتھ غصّے کی بھی آمیزش تھی۔ اب "خلافت و مُلوکیّت" لکھ کر عُمر کے آخری حصّے میں جو کمائی آپ نے کی ہے اُس کی وجہ

سے غصّے کی جگہ حسرت نے لے لی ہے حقیقت یہ ہے کہ اب آپ کے بارے میں سوچتے ہوئے دل کانپنے لگتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلنے لگتی ہے کہ :۔۔۔۔۔۔
رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○ بایں ہمہ! اب جب کہ ہم آپ کے کچھ قدیم ساتھی، رفیق اور نیازمند دین کی چھوٹی بڑی خدمت کے ارادے سے جمع ہو رہے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے خیال کے مطابق ہم آپ ہی کے ترک کردہ مشن کے لیے اُٹھ رہے ہیں۔ اس شیرازہ بندی سے مقصود ہرگز آپ کی مخالفت نہیں ہے۔ اگرچہ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کہ "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" کی رُو سے آپ کی جن باتوں کو ہم غلط سمجھتے ہیں اُن پر لامحالہ تنقید کرنی ہوگی تاہم اس سے مقصود سوائے اصلاح کے اور کچھ نہ ہوگا۔۔۔"

مولانا حمید الدّین فراہیؒ کا انتقال بھی راقم کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل ہو گیا تھا۔ اور غالباً ۱۹۵۳ء ۔ ۱۹۵۴ء تک راقم مولانا کے نام تک سے واقف نہ تھا۔ بعد میں جب مولانا امین احسن اصلاحی کی وساطت سے ان سے تعارف ہوا اور ان کی تحریریں بھی دیکھنے میں آئیں اور اُن کے حالاتِ زندگی بھی معلوم ہوئے تو اندازہ ہوا کہ واقعتاً ایک نہایت عظیم ہستی تھی جو نہایت خاموشی کے ساتھ قرآنِ حکیم پر غور و فکر اور تدبّر و تفکّر کی ایک بالکل نئی طرح ڈال کر رخصت ہو گئی۔ اُن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ راقم الحروف کے تصوّر میں اُبھرتا ہے وہ سُقراط سے بہت مشابہ ہے۔ ایک حکیم و دانا اور نیک و پارسا انسان جو لوگوں کی تعریف و تحسین اور تنقید و ملامت دونوں سے یکساں بے نیاز ہو اور یا تو خاموش تعقّل و تفکّر میں غرق ہو یا اپنے چند شاگردوں کو نہایت دھیمے طریق پر اور مکالمے کے سے انداز میں اس طرح درس دے رہا ہو جیسے کوئی بزرگ کسی بچّے کی اُنگلی پکڑ کر اسے چلنا سکھاتا ہے ۔۔۔۔۔۔ اور راقم اسے اپنی بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہے کہ اسے حکیم فراہیؒ کا نہ سہی اُن کے شاگردِ رشید کا قُرب تقریباً رُبع صدی تک حاصل رہا۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ تعلق کا آغاز تو مولانا مودودی کی طرح ۴۷ء

ہی میں ہوگیا تھا۔ (بلکہ راقم نے مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں کو پہلی بار ۱۹۴۰ء میں دارالاسلام پٹھانکوٹ میں دیکھا تھا! جہاں وہ اپنے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کی معیت میں حاضر ہوا تھا) لیکن ۱۹۵۱ء تک یہ تعلق کلیتہً یک طرفہ تھا یعنی صرف ان کی تقریریں اور درس سُن لینے تک محدود تھا۔ تا آنکہ اب سے ٹھیک پچیس سال قبل نومبر ۱۹۵۱ء کی ایک شام کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال لاہور میں راقم نے اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے تیسرے سالانہ اجتماع کے موقعہ پر مولانا کے زیر صدارت اپنی وہ پہلی عوامی تقریر کی جو اب تک جمعیت کے دعوتی لٹریچر کا اہم جزو ہے اور "ہماری دعوت اور ہمارا طریق کار" کے عنوان سے طبع ہوتی ہے۔ راقم کی اس تقریر کی تعریف و تحسین مولانا نے دل کھول کر فرمائی ——— اور یہیں سے وہ یک طرفہ تعلق، باقاعدہ 'دوطرفہ تعلقات' میں تبدیل ہوگیا ——— دسمبر ۱۹۵۱ء اور جولائی ۱۹۵۲ء میں جمعیت طلباء کی دو تربیتی گاہوں میں راقم ناظم کی حیثیت سے شریک رہا اور مولانا معلّم و مربّی کی حیثیت سے، اس سے ان تعلقات کی گہرائی و گیرائی میں نمایاں اضافہ ہوا ——— بعد کے چار سالوں کے دوران میں بے تکلفانہ ملاقاتوں سے یہ تعلق مزید استوار ہوا ——— ۱۹۵۶ء میں جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں مولانا نے راقم کے متذکرہ بالا اختلافی بیان کی نہایت شاندار الفاظ میں تصویب و تائید کی۔ اس طرح جماعت میں پالیسی کے بارے میں جو اختلافِ رائے ہوا اس کے ضمن میں بھی ع "ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز" کے مصداق مولانا اور راقم ایک ہی صف میں شامل ہوگئے ——— ۱۹۵۸ء میں جب مولانا نے بھی جماعت کو خیرباد کہہ دیا اور کسی نئی تعمیر کی فکر میں مشاورتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی مسلسل شامل رہا۔ اور اس سلسلے کا اہم ترین اجتماع عزیز منیر ہڑپہ میں راقم ہی کے زیر اہتمام غالباً چار روز تک جاری رہا لیکن افسوس کہ کوئی متفق علیہ نقشہ نہ بن سکا۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں راقم ان مشاورتوں کی مسلسل ناکامی سے بددل سا ہوکر ڈاکٹر مسعود الدین حسن عثمانی کی دعوت پر بغیر مولانا کو اطلاع دیئے کراچی منتقل ہوگیا تو ایک حد درجہ محبت بھرا شکوہ مولانا نے اپنے ایک مکتوب میں کیا:

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"آپ کے اس خفیہ اقدام کی اطلاع سیال صاحب سے مجھے ہو چکی تھی۔ بہر حال جو کچھ آپ نے کیا اچھا کیا۔ خدا کرے آپ کے مقاصد وہاں پورے ہوں اور آپ کو وہاں دلجمعی کے ساتھ کچھ لکھنے پڑھنے کی فرصت ملے۔ ڈاکٹر صاحب کی رفاقت ان شاء اللہ آپ کے لیے موجبِ خیر و برکت ہوگی۔ فرزانوں کے ساتھ نباہ مشکل ہوتا ہے، دیوانے گذارے جاتے ہیں آپ دونوں دیوانے ہیں۔ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو ——— مجھے جو احساس ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپ مجھ سے دُور ہو گئے۔ آپ سے ایک قلبی لگاؤ سا ہو گیا ہے، اس وجہ سے اس بات سے تھوڑی سی تکلیف ہے کہ میں نے جتنا ہی کھینچا چاہا اتنے ہی آپ کھنچتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ کھنچتے کھنچتے کراچی پہنچ گئے۔ خیر صاحب، جہاں رہو سلامت رہو اور دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھو!

....."

۱۹۵۹ء میں اس خیال سے کہ محض ایک سابقہ تعلق کی بنیاد پر نئی تعمیر ممکن نہیں ——— اس کی فکری اساسات کو تفصیل کے ساتھ واضح کیا جانا چاہیے۔ مولانا نے ماہنامہ 'میثاق' جاری فرمایا تو، جیسا کہ پہلے بھی ایک موقع پر عرض کیا جا چکا ہے، راقم اس کے اوّلین معاونین میں بھی شامل تھا اور بعد میں بھی مقدور بھر اعانت کرتا رہا اور دوسری طرف کراچی سے والد معاصب مرحوم کی علالت کے باعث واپسی پر ۱۹۶۰ء میں راقم نے منٹگمری (حال ساہیوال)

لے ان 'مشاورتوں' پر ایک نہایت دلچسپ تبصرہ اس زمانے میں ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم نے چست کی تھی۔ ہوا یوں کہ ملک صاحب علیل تھے، راقم اور مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف ان کی عیادت کے لیے ان کے پارک لین، ٹمپل روڈ والے مکان میں حاضر ہوئے، تو باتوں باتوں میں ان 'مشاورتوں' کا ذکر بھی آ گیا۔ اس پر ملک صاحب نے یہ لطیفہ سنایا کہ ایک بہت بڑے پیر صاحب نے اپنے خلفاء مجاز کی ایک مشاورت طلب فرمائی، اور مشورہ طلب بات یہ پیش کی کہ "عمر بیت کہ آوازۂ منصور کہن شد! آپ لوگوں کا کیا خیال ہے، کیا ہم اس کا اعادہ نہ کر دیں؟ ——— سب لوگوں نے اپنی اپنی رائے پیش کی، کسی نے اثبات میں کسی نے نفی میں، ایک صاحب خاموش رہے۔ حضرت نے ان سے براہِ راست استفسار کیا تو انہوں نے مؤدبانہ گذارش کی کہ "حضرت میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا منصور نے بھی وہ اقدام کسی سے مشورہ لے کر کیا تھا!"

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

میں ایک اسلامی ہاسٹل قائم کیا اور حلقۂ مطالعہ قرآن کی داغ بیل ڈالی تو مولانا نے ان سے ان کاموں میں بھرپور تعاون فرمایا۔ ہاسٹل کی تجویز پر ایک مفصّل تائیدی شذرہ 'میثاق' میں تحریر فرمایا اور حلقۂ مطالعۂ قرآن منٹگمری کی دعوت پر تقریر کے لیے دو بار ساہیوال کے سفر کی زحمت برداشت کی!

۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک تقریباً چار سال راقم نے دوبارہ ایک دوسرے سلسلے میں کراچی میں بسر کئے۔ اور اس عرصے میں راقم کا رابطہ مولانا سے بہت کم رہا۔ مولانا نے اس دوران میں بعض دوسرے احباب کے ساتھ مل کر 'مجلسِ دعوت و اصلاح' کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن نہ تو یہ بیل ہی منڈھے چڑھی نہ ہی اجتماعی کام کا کوئی اور نقشہ تیار ہو سکا۔ اس سے بددل ہو کر مولانا نے ذاتی طور پر 'حلقۂ تدبّرِ قرآن' قائم فرمایا اور اپنی ساری توجہات چند نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دیں۔ دوسرے احباب سے ان دنوں مولانا کا رابطہ کمزور پڑتے پڑتے معدوم کے حکم میں آگیا جس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ 'میثاق' نے پہلے تو کچھ عرصے تک ہچکیاں لیں اور بالآخر بالکل دم توڑ دیا ـــــــــ یہ حالات تھے جب راقم ۱۹۶۶ء میں دوبارہ واردِ لاہور ہوا میثاق بند پڑا تھا، تفسیر کی جلد اوّل تیار تھی لیکن اس کی طباعت و اشاعت کی کوئی سبیل دُور دُور تک نظر نہ آتی تھی۔ 'حلقۂ تدبّرِ قرآن' میں جن نوجوانوں پر مولانا نے شدید محنت کی تھی وہ سب بسلسلۂ روزگار تتّر بتّر ہو گئے تھے۔ ایک صاحب کسی ٹریننگ کے سلسلے میں انگلستان جا چکے تھے دوسرے صاحب کا تبادلہ ڈھاکہ میں میں ہو گیا تھا۔ بعض دوسرے لوگ بددل ہو گئے تھے ـــ الغرض بالکل ؏

"دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا"

والا سماں تھا ـــــــــ خود راقم کے سامنے لاہور نقلِ مکانی میں دو مقصد تھے: ایک 'حلقۂ تدبّرِ قرآن' میں شرکت اور مولانا کے سامنے باضابطہ زانوئے تلمذ تہ کر کے ان سے استفادہ اور دوسرے اس اصل تحریکِ اسلامی کے احیاء کی سعی جو راقم کے خیال کے مطابق جماعتِ اسلامی کے انتقالِ موقف کے باعث مردہ ہو چکی تھی ـــــــــ لاہور آ کر اندازہ ہوا کہ مولانا 'حلقۂ تدبّرِ قرآن' سے بھی بددل ہو چکے ہیں اور اس نہج پر از سرِ نو محنت کی

ہمّت اپنے اندر نہیں پاتے —— اور اب سارا وقت اور ساری محنت تفسیر کی تسوید پر صرف کر دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا راقم کا پہلا مقصد تو فوت ہو گیا۔ لیکن ہمّت کر کے 'تدبّرِ قرآن' کی جلد اوّل اس نے شائع کر دی اور مولانا نے ازراہِ شفقت اس زمانے میں برملا نہ صرف راقم سے کہا بلکہ دوسرے بہت سے احباب و رفقاء کے سامنے فرمایا کہ 'یہ اس کا مجھ پر ذاتی احسان ہے'! راقم کے سامنے اصل مسئلہ یہ تھا کہ اگر جلد اوّل شائع نہ ہوئی تو آگے لکھنے پر مولانا کی طبیعت مائل نہیں ہو گی اور یہ کام ادھورا رہ جائے گا ——

دوسرے مقصد کے ضمن میں راقم نے اوّلاً مولوی محی الدّین سلفی مرحوم کی تحریک پر اور ان کے تعاون سے اپنا اختلافی بیان "تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے شائع کیا۔ اور بعد ازاں ایک باضابطہ دعوت کے آغاز کے لیے 'الرسالہ' کے نام سے ایک ماہنامے کا ڈیکلریشن حاصل کر لیا۔ مولانا کو جب اس کی اطلاع ہی تو انہوں نے فرمایا کہ کوئی نیا رسالہ جاری کرنے کی بجائے 'میثاق' ہی سنبھال لو۔ میں تو اسے جاری نہیں رکھ سکتا۔ تم شائع کرتے رہو گے تو کم از کم اس کا نام تو رہے گا 'اِمْتِثَالاً لِلْاَمْر' راقم نے بہت دوڑ دھوپ سے حاصل کیا ہوا ڈیکلریشن ضائع کر دیا اور اگست ۱۹۶۶ء سے "زیرِ سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی" 'میثاق' کی ادارت سنبھال لی۔

۱۹۶۶ء، ۱۹۶۷ء کے دوران 'میثاق' کے ذریعے راقم نے ایک طرف تو یہ واضح کیا کہ ۱۹۵۶ء، ۱۹۵۷ء میں جماعتِ اسلامی میں جو اختلافِ رائے واقع ہوا تھا اس کی اصل نوعیّت کیا تھی اور علیٰحدہ ہونے والے علیٰحدگی اختیار کرنے پر کس طرح مجبور کر دیئے گئے تھے —— اور دوسری طرف علیٰحدہ ہونے والوں کو للکارا کہ اگر وہ جماعتِ اسلامی میں کسی شخصی عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ 'فریضۂ اقامتِ دین' کی ادائیگی کے لیے شامل ہوئے تھے تو جماعت سے علیٰحدگی سے وہ فرض تو ساقط نہیں ہو گیا۔ ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے مجتمع ہو کر جدّ و جُہد کریں۔ اس کا بحمداللہ خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور اواخر ۱۹۶۷ء میں جماعتِ اسلامی سے علیٰحدہ ہونے والے بعض احباب کا ایک اجتماع رحیم یار خاں میں منعقد ہوا جس میں "ایک نئی دینی تنظیم" کے قیام کا فیصلہ

کرلیا گیا۔ اس اجتماع میں مولانا بھی شریک تھے اور انہوں نے اس موقع پر بھی حسب عادت نہایت فراخدلی سے ان لوگوں کو خراج تحسین ادا کیا تھا جنہوں نے انہیں بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے مندرجۂ ذیل الفاظ راقم نے ستمبر/اکتوبر ۱۹۶۷ء کے 'میثاق' کے کور پر نمایاں حیثیت سے شائع کئے تھے:

"عزیز ساتھیو!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق کرلیا۔ میں اس پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لیے عزم و ہمت عطا فرمائے اور ہر قدم پر ہماری دست گیری اور رہنمائی فرمائے۔

میں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند اس کی ضرورت، اور اہمیت مجھ پر واضح تھی لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی کسی ذمہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو رہے ہیں، کوئی بھاری بوجھ اٹھانا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے آخری دور کے لیے اپنے ذوق کے مناسب جو کام میں نے تجویز کرلیا تھا اب وقت و فرصت کا لمحہ لمحہ اسی پر صرف کرنا چاہتا تھا چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ دباؤ کے باوجود میں خود اس کے لیے پہل کرنے کی ہمت نہیں کرسکا۔ دوستوں نے جب کبھی اس فریضہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کرسکا لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر نگاہ کرکے ان کی بات کو ٹالتا ہی رہا۔ میں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اگرچہ میرے اوقات تمام تر دینی و علمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں۔ تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے اس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے جس کے سبب سے نہ صرف میری بعض صلاحیتیں سکڑ رہی ہیں بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود میں اپنے آپ کو معذور سمجھتا رہا جس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذور سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔

بہرحال اب میں پورے شرح صدر کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتا ہوں اور ان تمام

دوستوں کا دل سے شکرگزار ہوں جنھوں نے اس عظیم فرض کی اہمیت کو سمجھا اور ہم
سب کو اس کے سمجھانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر
عطا فرمائے۔" ــــــــ "امین احسن اصلاحی"

لیکن افسوس کہ سابقہ تمام مساعی کی طرح یہ کوشش بھی بالکل ع
"چلنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے!" کے سے انداز میں ناکام ہو کر رہ گئی۔

یہ دَور راقم کی زندگی میں ایک اہم موڑ (TURNING POINT) کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے کہ اس وقت راقم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب کسی 'بڑے' کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔ اور کوئی چلے نہ چلے اور ساتھ دے نہ دے تن تنہا چلنا پڑا تب بھی سفر کا آغاز بہرحال کرنا ہے۔ گویا ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء دس سال مولانا مودودی کے ساتھ اور ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء، دس سال مولانا اصلاحی کے ساتھ راقم کلیۃً وکاملۃً وابستہ رہا۔ لیکن ۱۹۶۸ء سے (لگ بھگ چھتیس برس کی عمر میں) اس نے آزادی کے ساتھ اپنی ڈگر پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم بحمد اللہ، راقم اپنے ماضی سے منقطع نہیں ہوا اور اس نے ایک جانب حلقہ ہائے مطالعہ قرآن پر اپنی تمام تر مساعی صرف کر دیں اور ان کے ذریعے اصلاً قرآن کی اس انقلابی دعوت کا پرچار کیا۔ جس کے برصغیر میں موجودہ صدی کے داعیٔ اوّل تھے مولانا ابوالکلام آزاد اور جس کے تسلسل کو برقرار رکھا تھا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اور دوسری جانب 'دارالاشاعت الاسلامیہ' کے ذریعے اپنے جملہ وسائل و ذرائع کو کھپا دیا مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کی تصانیف کی اشاعت کے ذریعے تدبر قرآن کے اس اسلوب کی ترویج و اشاعت میں جس کے بانی ہیں مولانا حمید الدین فراہیؒ اور شارح ہیں مولانا امین احسن اصلاحی ــــ لیکن اب چونکہ راقم کسی ایک لکیر کا فقیر نہیں رہا تھا لہٰذا اس کی 'سوچ' کے دوسرے اجزائے ترکیبی بھی سامنے آنے لگے۔ اور ۱۹۶۸ء سے 'میثاق' میں 'افاداتِ فراہیؒ' اور 'تدبر قرآن' کے ساتھ ساتھ جگہ ملنے لگی نہ صرف مولانا سندھی مرحوم کے تذکرے اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے 'منشورِ اسلام' کو بلکہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے "ربّانیۃ لا رھبانیۃ" اور

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے "حقیقتِ تصوّف" اور "تاریخ تصوّفِ اسلامی" ایسے مضامین کو بھی۔ اور یہی چیز سببِ اوّل بن گئی مولانا اصلاحی کی راقم الحروف کی جانب سے گرانیٔ طبع کی۔ اس لیے کہ مولانا برملا فرمایا کرتے ہیں کہ "مَیں تصوّف کو کُل کا کُل ضلالت و گمراہی سمجھتا ہوں"! چنانچہ مولانا نے راقم سے مشفقانہ انداز میں فرمانا شروع کیا کہ "عزیزم! تمہارے بارے میں مجھے دو اندیشے لاحق ہیں۔ ایک یہ کہ تم انتہائی ذہین ہو اور دوسرے یہ کہ تمہارے اندر تصوّف کی لٹک موجود ہے!" راقم اسے ہنس کر ٹال دیتا رہا اور مولانا کی مروّت و شرافت کہ وہ تعلّقات کو (اپنے بعض شاگردوں اور احباب کی شدید سرگرانی کے علی الرّغم) نباہتے رہے!

۱۹۷۰ء کے دوران اُدھر تو مولانا علیل ہو گئے اور ان کی علالت تشویشناک صورت اختیار کر گئی اور اِدھر راقم کے حلقۂ ہائے مطالعۂ قرآن وسعت اختیار کر گئے اور اُس کے اعوان و انصار کا ایک خاصا بڑا حلقہ وجود میں آ گیا اور بالکل فطری طور پر کسی باقاعدہ ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے تحت کم از کم مالی اُمور منضبط کیے جا سکیں۔ یہی ضرورت تھی جس کے تحت 'مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور' کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ راقم اس سے بہت پہلے گہرے غور و خوض کے بعد اس حتمی نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ کسی دینی تنظیم میں شورائیت اس جمہوری طرز کی نہیں ہونی چاہیئے جس میں بقول علامہ اقبال مرحوم ع "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!" بلکہ اُس طرز کی ہونی چاہیئے جو اسلام کے نظامِ امارت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو۔ جس میں امیر صرف دستوری صدر نہیں بلکہ صاحبِ امر ہوتا ہے۔ چنانچہ بلا خوفِ لومۃ لائم راقم نے اپنے اس خیال کو تحریر و تقریر دونوں صورتوں میں بیان بھی کیا اور انجمن کا مجوّزہ دستور خاکہ بھی اسی نہج پر تیار کیا۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جیسے ہی یہ ڈھانچہ 'میثاق' میں شائع ہوا، مولانا بھی بفضلہٖ تعالیٰ صحتیاب ہو گئے۔ اب جو ان کے علم میں یہ خاکہ آیا تو وہ سخت برہم ہوئے اس لئے کہ اس معاملے میں بھی راقم کی اور ان کی رائے کے مابین بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ نتیجۃً وہ دو طرفہ تعلّقات جو بیس سال سے نہایت خوشگوار چلے آ رہے تھے ایک شدید بحران (CRISIS) سے دوچار ہو گئے۔ بعض احباب نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی لیکن

راقم نے صاف عرض کر دیا کہ اُس کی بھی یہ سوچی سمجھی رائے ہے اور اب اس میں تبدیلی صرف اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ اسے دلیل سے قائل کر دیا جائے۔ محض پاسِ ادب اور لحاظِ بزرگی کی بنا پر وہ اپنی رائے تبدیل نہیں کرے گا۔ چنانچہ "ھٰذا فِراق بینی وبینک" کا آغاز ہو گیا اور اس کے پہلے قدم کے طور پر طے پایا کہ "میثاق" کے سرورق پر سے "زیرِ سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی" کے الفاظ حذف کر دیئے جائیں۔ تاہم یہ مولانا کی عالی ظرفی ہے کہ اس کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ ذاتی تعلقات برقرار رہے بلکہ جزوی تعاون بھی جاری رہا۔

مارچ ۱۹۷۲ء سے انجمن خدام القرآن کی سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور اس میں راقم نے تقریباً تمام مکاتبِ فکر کے علماء کو صدارت یا خطاب کے لئے دعوت دی جسے ان کی اکثریت نے ازراہِ شفقت و عنایت منظور فرما لیا۔ یہ چیز راقم کے اور مولانا کے مابین مزید بُعد و فصل کا سبب بن گئی۔ ان کا فرمانا یہ تھا کہ "ان مولویوں کو سر پر بٹھا کر کیا لینا ہے جو ان ہی کے خیالات و تصورات کی تو ہین و تردید کرتی ہے!" راقم نے اسے بھی خاموشی سے سنا ان سنا کر دیا اس لئے کہ اُس کی طبیعت کا رُخ جیسا کہ اوپر تفصیل سے بیان ہو چکا، بالکل دُوسرا ہے۔ تاہم اُس نے محسوس کر لیا کہ اب مولانا کے مزاج میں تلخی بڑھتی جا رہی ہے۔

جولائی ۱۹۷۲ء میں راقم نے اعلان کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ یہ چھوٹی سی تحریکِ اسلامی جس کا آغاز "دعوتِ رجوع الی القرآن" سے ہوا تھا اور جس نے پہلی تنظیمی ہیئت "انجمن خدام القرآن" کی صورت میں اختیار کی تھی اگلے تنظیمی مرحلے میں قدم رکھے اور ٹھیٹھ دینی اصولوں پر جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جس کا ہیولیٰ راقم کے پیشِ نظر وہی تھا جو ۱۹۶۷ء میں اجتماع رحیم یار خاں میں طے پایا تھا۔ چنانچہ "میثاق" کی ستمبر، اکتوبر اور نومبر ۱۹۷۲ء کی اشاعتوں میں راقم نے اپنی جولائی ۱۹۷۲ء والی تقریر اور تنظیمِ اسلامی کا ۱۹۶۷ء والا خاکہ ایک طویل اداریئے سمیت شائع کر دیا۔

اس موقع پر راقم مولانا کی خدمت میں ان کے گاؤں (رحمٰن آباد) حاضر ہوا تو مولانا نے جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ ——— پرچہ کل ہی ملا تھا، میں رات ہی پورا پڑھ ڈالا۔ اور رات کے دو بجے تک لالٹین کی روشنی میں اسے پڑھتا رہا۔

تم نے غلا کی نشاندہی بالکل صحیح کر دی ہے۔ اور کرنے کا کام بھی ٹھیک متعین کر دیا ہے البتہ تم نے بہت بھاری بوجھ اٹھا لیا ہے اور ایک بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر اس کی ہمت نہ تھی۔ لیکن اب جبکہ تم نے یہ بوجھ اٹھا ہی لیا ہے تو میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ تم اس میں ناکام ہو بلکہ دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ تمہیں کامیاب کرے ــــــ اس لئے کہ میں ہرگز ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اگر خود کوئی کام نہیں کر سکتے تو کسی دوسرے کو کرتا بھی نہیں دیکھ سکتے . . . . .

مولانا کا یہی وہ حوصلہ افزا طرز عمل تھا جس سے راقم کو جرأت ہوئی کہ مارچ ۱۹۷۵ء میں جب تنظیم اسلامی کا باضابطہ قیام عمل میں آیا۔ اور اس کا دستور طے پایا تو اس میں ایک 'حلقۂ مستشارین' بھی رکھا گیا۔ جس کی زبانی اطلاع پر تو مولانا نے شیخ جمیل الرحمان صاحب اور کراچی کے بعض دوسرے رفقاء سے یہ فرمایا کہ "آپ لوگوں نے یہ بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے یہ خدمت میں بخوشی سرانجام دوں گا ــــ لیکن جب باقاعدہ تحریری صورت میں وہ خاکہ اُن کے سامنے آیا تو انہوں نے اس میں شمولیت سے انکار فرمایا۔ یہاں مناسب ہے کہ دستور تنظیم اسلامی کی وہ دفعہ پوری کی پوری نقل کر دی جائے۔ وَھُوَ ھٰذَا :-

"**دفعہ - ۵ حلقۂ مستشارین**

(الف) ایسے اصحابِ علم و فضل پر مشتمل ایک حلقۂ مستشارین قائم کیا جائے گا جو کسی سبب سے تنظیم اسلامی میں باقاعدہ تو شریک نہ ہوں البتہ اس کے نظریات سے مجموعی اتفاق اور اس کے مقاصد سے عمومی دلچسپی رکھتے ہوں اور یہ ذمہ داری قبول کرلیں کہ وہ عند الطلب مشورہ بھی دیتے رہیں گے اور تنظیم کی جملہ سرگرمیوں پر نگاہ بھی رکھیں گے اور اگر کہیں غلط رجحان نظر آیا تو اس پر متنبہ کر دیں گے۔

(ب) اس حلقے میں صرف وہی اہل علم و فضل شرکت کر سکیں گے جن سے تنظیم خود درخواست کرے۔

(ج) اس حلقے کے کوئی صاحب اگر کوئی غلط رجحان دیکھیں تو وہ اوّلاً داعئ عمومی کو متوجہ کریں گے اور بعد ازاں اگر ضرورت محسوس کریں تو ان کی رائے جملہ رفقائے تنظیم کے علم میں لانا ناظم عمومی کی ذمہ داری ہو گی۔ خواہ تنظیم کے کسی

آرگن میں اشاعت کے ذریعے ہو خواہ کسی سرکلر وغیرہ کے ذریعے "

مولانا کے انکار پر راقم نے مولانا کو خط میں لکھا کہ "میں آپ کو مجبور تو ہرگز نہیں کر سکتا لیکن یہ بات کہ تنظیم کا ایک حلقہ مستشارین ہو اور اُس میں آپ نہ ہوں مجھے گوارا نہیں"۔ لہٰذا راقم نے رفقائے تنظیم کے مشورے سے حلقہ مستشارین ہی کو ساقط کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے بعد بھی لگ بھگ ایک سال تک مولانا کی خدمت میں راقم کی حاضری کا سلسلہ جاری رہا۔ جنوری ۷۶ء میں 'قرآن اکیڈمی' کی تعمیر کے آغاز کا مرحلہ آیا اور ساتھیوں نے اس موقع پر ایک اجتماعی دعا کا پروگرام بنایا تو اُس میں شرکت کی دعوت راقم نے مولانا کو بھی دی۔ جسے انہوں نے کمال شفقت و مروّت سے منظور فرما لیا۔ اور وہ برادرم نعمان علی صاحب کی معیت میں تشریف لائے۔ لیکن بعد میں بعض حضرات سے سننے میں آیا کہ مولانا نے فرمایا ہے کہ "میری طبیعت بالکل آمادہ نہ تھی لیکن جب اُس نے کہا تو میں انکار نہ کر سکا اور مجبوراً شریک ہو گیا"۔ راقم کی اصل مشکل یہ تھی کہ مولانا سے ملنا جلنا بھی ہو اور پھر انہیں اپنے کاموں میں شرکت کی دعوت نہ دی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ رہے سہے تعلق کو خود راقم نے ختم کر دیا ——— اسی پس منظر میں راقم نے مارچ ۷۶ء میں تیسری سالانہ قرآن کانفرنس میں شرکت کی دعوت مولانا کو دی اور حسبِ سابق اسے بھی مولانا نے منظور فرما لیا لیکن بعد میں اپنے بعض دوستوں اور شاگردوں کے اصرار پر شرکت سے انکار کر دیا ——— یہ گویا ان دو طرفہ تعلقات کے ضمن میں اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا اور راقم نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ بھی بند کر دیا جائے تاکہ وہ بار بار اس طرح کی پریشان کن صورتِ حال سے دوچار نہ ہوں۔ اور اس طرح ربع صدی پر پھیلے ہوئے وہ تعلقات اختتام پذیر ہو گئے جو پورے بیس سال نہایت گرم جوشی کے ساتھ قائم رہے اور بعد ازاں ع "کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی" کے مصداق پورے پانچ سال میں رفتہ رفتہ کم ہو کر اس حد کو پہنچے کہ اب آٹھ ماہ سے صورت وہی پیدا ہو چکی ہے کہ ؎

بس اتنا سا تعلق اب ان سے رہ گیا ہے وہ مجھ کو جانتے ہیں، میں ان کو جانتا ہوں!

یہ طویل داستان ہماری موجودہ بحث کے اعتبار سے یقیناً جملۂ معترضہ کے حکم میں ہے۔ لیکن اسے بتمام وکمال اس لئے بیان کر دیا گیا کہ ادھر کچھ عرصے سے راقم سن رہا ہے کہ مولانا کو یہ تشویش ہے کہ راقم ان کا نام استعمال کر رہا ہے اور حال ہی میں ماہر القادری صاحب نے بھی ،فاران، میں مولانا کا یہ "دُکھڑا سنایا"، جملہ نقل کر کے کہ "مجھے ڈاکٹر اسرار نے EXPLOIT کیا ہے!" درحقیقت راقم اور مولانا کے مابین اختلاف کو خود اپنے مذمومہ مقاصد کے لئے EXPLOIT کرنے کی کوشش کی ہے ——— تو جو جانتا ہے وہ تو جانتا ہی ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ ان سطور کا عاجز و ناکارہ راقم مولانا کی نظر عنایت سے قطعاً محروم ہو چکا ہے۔ مولانا کے ساتھ تعلق کا جو تسمہ اب لگا رہ گیا ہے وہ صرف مصنّف اور ناشر کے تعلق کی نوعیت کا ہے اور وہ بھی راقم اور مولانا کے مابین نہیں بلکہ انجمن خدام القرآن اور مولانا کے مابین ہے۔ اور اس ضمن میں بھی تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ مولانا نے تدبر قرآن کی پانچویں جلد کے حقوق طباعت جو مارچ ۷۶ء میں انجمن کو فروخت کئے تھے واپس لے لئے ہیں اور اس کی طباعت و اشاعت کا انتظام اب وہ خود فرمائیں گے لہٰذا اس ضمن میں جسے بھی کوئی رابطہ قائم کرنا ہو وہ ان ہی سے کرے!

عربی کا ایک مشہور شعر ہے:

إِنَّ الفَتیٰ مَن یقول ھا انا ذا ‌‌ ‌ لَیسَ الفتیٰ مَن یقول وکانَ ابی !

تو راقم کو تو اگرچہ فتوّت کا کوئی دعویٰ سرے سے ہے ہی نہیں۔ تاہم اُس نے نہ صرف یہ کہ اپنی ذاتی خوش بختیوں اور محرومیوں کی مفصّل داستان ادبرقم کر دی ہے بلکہ اپنے فکری "آباؤ اجداد" کی پوری تفصیل بھی بیان کر دی ہے:

افسوس اس کا ہے کہ ہمارے یہاں دوسرے تمام حقوق کے مانند 'اختلاف رائے' کا حق بھی مانگتے تو سب ہیں دیتے کو کوئی تیار نہیں اور ہر بڑا شخص "وما ولاغیری" کے سے انداز میں کُلّی متابعت اور کامل پیروی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس ضمن میں اوپر علماء کرام کے بارے میں مولانا اصلاحی کا قول تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ مولانا بنوری صاحب نے بھی ایک بار فرمایا کہ "ذاتی حیثیت میں آپ مجھے بہت عزیز ہیں، آپ جب بھی مشورہ طلب کریں گے میں پوری توجہ کروں گا۔

لیکن تنظیمِ اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں شرکت سے میں اس لئے معذور ہوں کہ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اس کے لئے میرے پاس نہ فرصت ہے نہ صحت ـــــ ویسے یہ بات بھی ہے کہ آپ مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ہم ان کے معلّمِ اوّل امام ابن تیمیہؒ کو علم کا بحرِ ذخار ماننے کے باوجود اہمیت نہیں دیتے تو ان لوگوں کی تو حیثیت ہی کیا ہے!"

نتیجہ یہ ہے کہ علماء کرام راقم سے اس لئے ناراض ہیں کہ وہ اس دور کا اصل "ترجمان القرآن" علامہ اقبال کو کیوں قرار دیتا ہے۔ اور علامہ مرحوم کے عقیدتمند اس لئے خفا ہیں کہ وہ ان کے نام کے ساتھ 'حضرت' اور 'رحمۃ اللہ علیہ' کے سابقے اور لاحقے کیوں نہیں لکھتا اور دیوبند و تھانوی حلقے اس لئے ناراض ہیں کہ شخصاً راقم کی اصل عقیدت مولانا محمود حسنؒ اور مولانا مدنی رحمہ سے ہے اور حضرت مدنیؒ کے عقیدتمند اس لئے خفا ہیں کہ راقم اُن کی سیاسی حکمتِ عملی پر کیوں تنقید کرتا ہے۔

الغرض معاملہ وہ ہے کہ ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش … میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

مزید برآں احناف کے نزدیک راقم 'وہابی' ہے اور اہلحدیث حضرات کے نزدیک 'حنفی' ـــــ گویا ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا … اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں!

اور نوبت باینجا رسید کہ منکرِ حدیث ہونے کی تہمت تو خاصے عرصے سے لگ ہی رہی تھی، اب سننے میں آیا ہے کہ اس خاکسار کے قادیانی ہونے کی 'خبر' بھی بعض حضرات نے اہتمام کے ساتھ دُور دُور تک پہنچائی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

راقم کے لئے اس صورتِ حال میں دوہری نوید ہے۔ ایک اس کی کہ اس میں اس "وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا" (آل عمران: ۱۸۷) کا عکس نظر آتا ہے اور دوسری اس کی کہ [illegible] کی مساعی بارآور ہو رہی ہیں اور اس کی دعوت [illegible] ہو رہا ہے یعنی [illegible] اور دشنام

طرازیاں توگویا اس راہ کے ابتدائی سنگ ہائے میل اور نشانات راہ ہیں ـــــ
هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ـــــ
(الاحزاب : ۲۲) رہی بزرگوں کی نگاہِ التفات اور نظرِ کرم سے محرومی تو اس باب میں بھی راقم مطمئن ہے کہ ؎

شرک چھوڑا توسب نے چھوڑدیا ۔۔۔ میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں! (اکبر)

ویسے راقم بحمداللہ حضرتِ اکبرؔ ہی کے اس شعر کہ ؎

دیوانۂ چمن کی سیر یں نہیں ہیں تنہا ۔۔۔ عالم ہے ان گلوں میں بھولوں میں بستیاں ہیں!

اور فیضؔ کے اس شعر کہ ؎

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیمِ صبحِ وطن ۔۔۔ یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے!

اور اقبالؔ کے اس شعر کہ ۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں ۔۔۔ یہاں اب میرے رازداں اور بھی ہیں.

کے مصداق بالکل یکہ و تنہا بھی نہیں ہے ۔ بلکہ اسے اللہ نے ہمراہیوں اور ہمسفروں کی ایک معتدبہ تعداد اور اعوان و انصار کی اچھی بھلی جمعیت عطا فرمادی ہے اور اس کی دس سالہ مساعی کو ربّ العٰلمین نے اس درجہ بار آور کیا ہے اور ایسا شرف قبول عطا فرمایا ہے کہ راقم خود حیران ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ راقم پر علّامہ اقبال کے ان اشعار کی صداقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں ۔۔۔ راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں ۔۔۔ جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں ۔۔۔ ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

ورنہ نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے ۔۔۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

چنانچہ لاہور، کراچی اور سکھر تو راقم کی دعوتِ قرآنی اور درسِ قرآن کے بڑے مراکز رہے ہی ہیں، گذشتہ دس سالوں کے دوران راقم اس پیغام کو لے کر ایک جانب گوجرانوالہ، شیخوپورہ، وزیرآباد، گجرات، جہلم، سرگودھا، جوہرآباد، راولپنڈی، اسلام آباد، واہ، ٹیکسلا اور تربیلہ تک گیا ہے اور دوسری جانب

ساہیوال، ملتان، بہاولپور، رحیم یارخاں، صادق آباد، حیدرآباد اور کوئٹہ تک، ——— اور نہ صرف یہ کہ تین عظیم الشان سالانہ قرآن کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں بلکہ لاہور اور کراچی میں دو دو بار، اور کوئٹہ اور راولپنڈی میں ایک ایک بار قرآنی تربیت گاہیں قائم کی جا چکی ہیں ——— اور ان پر مستزاد ہیں سلسلۂ مطبوعات[1] کے ذریعے دعوت قرآنی کی توسیع اور دوسرے ذرائع نشر و اشاعت کے ذریعے لوگوں کی توجہات کو قرآن حکیم کے جانب منعطف کرنے کی کوششیں مثلاً لاہور کے عوامی میلوں، رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماعات اور یوم اقبال کی تقریبات میں اخباری اشتہاروں، پوسٹروں اور ہینڈبلوں کے علاوہ دس دس ہزار کی تعداد میں "دعوت الی اللہ" اور "راہ نجات" ایسے کتابچوں کی تقسیم۔ اور آخری مگر کمترین نہیں، قرآن اکیڈمی کی تعمیر کا آغاز جس پر ان سطور کی تحریر کے وقت تک کم وبیش پانچ لاکھ روپیہ صرف ہو چکا ہے! ——— اور ان سب کا حاصل یہ کہ "درس قرآن" کا چرچا تو بحمداللہ دُور دُور تک ہے ہی کم ازکم پاکستان کے طول وعرض میں راقم کا نام "دعوت رجوع الی القرآن" کی علامت بن گیا ہے! ذالك فضل الله یوتیه من یشاء۔

ع این سعادت بزور بازو نیست ——— تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

مزید برآں ——— اور "نافلۃً لک" کے درجے میں یہ کہ "تنظیم اسلامی" کے نام سے ایک چھوٹا سا قافلہ فرمان نبوی "انا آمرکم بخمس":

---

[1] جس میں امام فراہی اور مولانا اصلاحی کی گرانقدر تصانیف کے علاوہ شامل ہیں راقم کے مختصر کتابچے بھی، جن میں سے ایک یعنی "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" کا ذکر تو اوپر ہو چکا ہے۔ لیکن دوسرے یعنی "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کا ذکر نہیں ہو پایا۔ حالانکہ اس کے ذکر کے بغیر یہ مضمون نامکمل رہ جائے گا۔ اس لئے کہ نہ صرف یہ کہ بحمداللہ اس کے پانچ ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں بلکہ اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا پروفیسر محمد ابراہیم مرحوم نے حد درجہ عقیدت و احترام کے جذبات کے ساتھ اور عربی میں کیا مولانا صہیب حسن السلفی نے یہ کہہ کر کہ "اس کو پڑھنے سے خود مجھ پر جو اثر ہوا اس سے میں نے سوچا کہ اگر کسی کتابچے سے ایک 'مولوی' بھی متاثر ہو سکتا ہے تو عوام کے حق میں تو وہ لازماً تریاق ہوگا"

بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ"
میں بیان شدہ مقاصد کے پیش نظر سفر کا آغاز کر چکا ہے اور اس راہ کے پہلے
اقدام یعنی تجدید ایمان، توبہ اور تجدید عہد کی دعوت زبانوں پر آنے اور کانوں
سے ٹکرانے لگی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قافلہ بھی بہت ہی چھوٹا ہے اور اس کا قائد بھی
حد درجہ حقیر پُر تقصیر۔ لیکن یہ اطمینان پوری طرح حاصل ہے کہ کرنے کا کام ہے یہی!

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی　　اہل فراق کیلئے عیش دوام ہے یہی!

راقم کو جو ساتھی ملے ہیں وہ راقم کے لئے اللہ کا عطیہ ہیں۔ اور راقم تو قائل ہی اس
کا ہے کہ ع "ہر چہ ساقی مارینخت عین الطاف است!" کبھی ان سے کسی کی سست
رفتاری یا سہل انگاری سامنے آتی ہے تو راقم اپنے آپ سے کہتا ہے کہ ؎

نومید نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ　　کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں یہ ہی!

اور اس عاجز پر اللہ کا یہ بڑا فضل ہے کہ جب کسی ساتھی سے کسی کمزوری
کا ظہور ہوتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ لامحالہ اس کی اپنی ہی کسی کمزوری کا مظہر ہے!

اور سب سے بڑھ کر اطمینان بخش بات یہ ہے کہ اس دعوت کا آغاز نہ کسی
مصنف کی تصانیف سے ہوا نہ کسی خطیب کے خطبات و تقاریر سے بلکہ بحمد اللہ
"درس قرآن" سے ہوا۔ اور اب بھی اس کا دار و مدار اور مرکز و محور ہے اللہ
کی کتاب! ——— اور اللہ کی کتاب کی ترجمانی اور افہام و تفہیم میں بھی، بفضلہ
تعالیٰ وعونہ، کسی ایک لکیر کی فقیری نہیں بلکہ ابوالکلام اور ابوالاعلیٰ کی دعوتِ
جہاد کا عنصر بھی شامل ہے اور فراہیؒ اور اصلاحی کے تفکر و تدبر[1] کا جوہر بھی،
اور شیخ الہندؒ اور شیخ الاسلامؒ کے احوالِ باطنی و نکاتِ روحانی کی چاشنی بھی

---

[1] یہ بات اب تو یقیناً مولانا اصلاحی اور ان کے بعض شاگردوں کو بہت ناگوار ہو گی۔ لیکن غالباً مولانا بھولے نہ ہوں گے جناب وحید الدین خاں صاحب کی شہادت جو انہوں نے راقم کے بعض دروس میں شمولیت کے بعد مولانا کے سامنے دی تھی کہ راقم کے درس میں فکر فراہیؒ کے اثرات سموئے ہوئے ہیں اور اگر یہ یاد نہ ہو تو بھی مولانا کے اپنے وہ الفاظ تو مطبوعہ موجود ہیں جو انہوں نے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" پر تقریظ میں تحریر فرمائے تھے کہ ——— "اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے قلم میں برکت دے کہ وہ ایسی بہت سی چیزیں لکھنے کی توفیق پائیں۔ ہماری بہت سی عزیز

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

موجود ہے اور ڈاکٹر اقبال کے جذبہ ملّی کی حرارت اور ان کی اور ڈاکٹر رفیع الدین کی علوم جدیدہ اور فکر جدید پر قرآن حکیم کی روشنی میں جرح و تنقید کی کڑوی گولیاں بھی! ——— یہی وجہ ہے کہ ناقدین نے تو یہ کہا کہ "آپ کے درس کے بارے میں یہ بات بہرحال ماننی پڑتی ہے کہ اس سے ہر شخص کچھ نہ کچھ ضرور لے کر اٹھتا ہے"[1] اور احباب کا کہنا یہ ہے کہ اس میں حد درجہ 'جامعیت' ہوتی ہے ——— اگر اُن کا خیال کسی بھی درجے میں صحیح ہے اور جامعیّت سے کوئی حصّہ راقم کو فی الواقع ملا ہے تو یہ سرسر افیض ہے امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے اُنسِ قلبی، مناسبت ذہنی اور کسی درجے میں نسبتِ رُوحانی کا۔ اور اگر ان کا خیال مطابقِ واقعہ نہیں تب بھی راقم ربّ العزت سے خواستگار ہے کہ وہ اسے اُس جامعیتِ کبریٰ میں سے قدرِ قلیل ہی سہی مگر کچھ نہ کچھ حصہ ضرور عطا فرما دے جس کا مظہرِ اتم تھے بارھویں صدی ہجری میں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور چودھویں صدی ہجری میں شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ ——— گویا بقول اقبال ؎

"میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر!"

اور ظاہر ہے کہ اللہ کی شانِ کریمی سے یہ بعید بھی نہیں۔

ع "شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!"

□□□□□□□□□

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اُمیدیں ان سے وابستہ ہیں"، عجب اتفاق ہے کہ اسی کے لگ بھگ الفاظ مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے مولانا حمید الدّین فراہیؒ کی وفات پر تعزیتی مضمون میں ان کے تلامذہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا اصلاحی کے بارے میں لکھے تھے کہ "... جن میں قابل ذکر مولوی امین احسن اصلاحی ہیں۔ ہماری آئندہ توقعات ان سے بہت کچھ وابستہ ہیں"

[1] یہ الفاظ ہیں مولانا اصلاحی کے شاگردِ رشید جناب خالد مسعود صاحب کے برادر نسبتی ڈاکٹر انوار احمد بگوی کے جو راقم کے کرم فرماؤں، اور شدید ناقدوں میں سے

پس نوشت

جولائی ۸۲ء

مولانا امین احسن اصلاحی سے وصل و فصل کی داستان کے آخر میں عرض کیا گیا تھا کہ: "مولانا کے ساتھ تعلق کا جو تسمہ اب لگا رہ گیا ہے وہ صرف مصنف اور ناشر کے تعلق کی نوعیت کا ہے اور وہ بھی راقم اور مولانا کے مابین نہیں بلکہ انجمن خدام القرآن اور مولانا کے مابین ہے ۔۔"

قارئین کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ اب یہ تعلق بھی ختم ہو چکا ہے ۔ اور انجمن نے اپنی ادا کردہ رقم واپس لیکر مولانا کو ان کی جملہ تصانیف کے حقوق اشاعت واپس لوٹا دیئے ہیں ۔

سبب اس کا یہ ہوا کہ 'تدبر قرآن' کی جلد چہارم میں سورۂ نور کی تفسیر کے ضمن میں مولانا نے حدِ رجم کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اُس نے کم از کم اس مسئلے میں انہیں اہل سنت کی صفوں سے نکال کر منکرینِ حدیث کی صف میں لا کھڑا کیا ہے ۔ جس وقت یہ جلد چھپی راقم نے ابھی اسے پڑھا نہیں تھا ۔ بعد میں جب یہ بات راقم کے علم میں آئی تو سخت صدمہ ہوا کہ اس رائے کی اشاعت میں راقم الحروف اور اُس کی قائم کردہ 'انجمن خدام القرآن' بھی شریک ہے ۔ تاہم جو تیر کمان سے نکل چکا تھا اُس پر تو اب سوائے استغفار کے اور کچھ نہ کیا جا سکتا تھا ۔ البتہ اس جلد کی دوبارہ اشاعت پر طبیعت کسی طور سے آمادہ نہ ہوئی ——— ادھر یہ بھی کسی طرح مناسب نہ تھا کہ ایک مصنف کی تصنیف کی اشاعت صرف اس لئے رُک جائے کہ وہ اُس کے حقوق اشاعت کسی ادارے کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے ——— بنا بریں تفسیر 'تدبر قرآن' کی بقیہ چار جلدوں کے ناشر برادرم ماجد خاور صاحب نے جیسے ہی مولانا کی جملہ تصانیف کے حقوق اشاعت کی واپسی کے سلسلہ میں گفتگو کی راقم نے فوری آمادگی کا اظہار کر دیا اور الحمد للہ کہ خاور صاحب کی مساعیٔ جمیلہ اور مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجلس منتظمہ کی منظوری سے یہ معاملہ بغیر کسی تلخی کے باحسن وجوہ طے پا گیا ——— الغرض مولانا سے اب یہ رشتہ بھی بالکلیہ منقطع ہو گیا ہے!

اسرار احمد

ضمیمہ

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی قرآنی خدمات

(ماخوذ از رُودِ کوثر، تالیف شیخ محمد اکرام بشکریہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ)

آپ کا سب سے اہم کام قرآن اور عُلومِ قرآنی کی اشاعت ہے اور اس سلسلے میں آپ کا بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی لیکن اس زبان میں قرآن مجید کا کوئی ترجمہ رائج نہ تھا[1]۔ چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان گلستان، بوستان، سکندر نامہ اور شاہنامہ تو پڑھتے اور سمجھتے، لیکن قرآن مجید سے جو ہدایات کا سرچشمہ ہے، ناواقف رہتے۔ پرانے علماء اور خواص میں سے قرآن مجید اگر کسی نے پڑھا تو ناظرانہ یعنی مفہوم و معانی سمجھنے اور اُس کی رُوح و تعلیمات سے فیضیاب ہونے کے بغیر۔ اکبر کے دربار میں جب مسلمان عُلما اور پرتگیز مشنریوں میں مباحثے ہوئے اور مشنریوں نے (جو کلامِ مجید کے لاطینی ترجمے کی وجہ سے اس کے اندراجات سے خوب واقف تھے) کلامِ مجید کے بعض حصّوں پر اعتراض کیے تو اس وقت پتہ چلا کہ جن مسلمانوں نے عربی میں قرآن پڑھا بھی تھا انھیں بھی اس کے مضامین اور اندراجات سے پُوری طرح واقفیّت نہ تھی۔ بسا اوقات یہ ہوتا کہ پادری کلامِ مجید کے کسی بیان پر اعتراض

---

[1] شیخ سعدیؒ کا ایک ترجمہ بھی اب بازار میں ملتا ہے، لیکن شیخ سعدیؒ سے اس کی نسبت مُشتبہ ہے اور یقیناً یہ ترجمہ کبھی بھی رائج نہیں ہُوا۔ شاہ صاحب سے پہلے ملک العُلما قاضی شہاب الدّین دولت آبادی نے سلاطینِ جونپور کے زمانے میں ایک تفسیر بحرِ مواج لکھی تھی جس میں ہر آیت کی تشریح و تفسیر سے پہلے اس کا ترجمہ دیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اس ترجمے کی حیثیت محض ضمنی اور جُزوی تھی اور اُسے کبھی بھی عام مقبولیّت نصیب نہیں ہوئی۔

کرتے اور مسلمان کہہ دیتے کہ یہ تو قرآن میں ہے ہی نہیں اور پھر جب کلامِ مجید کھول کے دیکھا جاتا تو وہ حوالے نکلتے۔ شاہ صاحب کو اس بُوالعجبی کا احساس ہوا اور حج سے واپس آنے کے پانچ سال بعد ۱۷۳۷-۳۸ء میں آپ نے فارسی زبان میں کلامِ مجید کا ترجمہ کیا۔ جب علما کو اس کا پتا چلا تو تلواریں کھینچ کر آگئے کہ یہ کلامِ مجید کی انتہائی بے اَدَبی ہے۔ بعض سوانح نگار لکھتے ہیں کہ اس مخالفت کی وجہ سے شاہ صاحب کی جان اس طرح خطرے میں پڑ گئی کہ انہیں کچھ عرصہ کے لیے دہلی سے چلے جانا پڑا۔ لیکن بالآخر شاہ صاحب کی جرأت اور فرض شناسی کامیاب ہوئی۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ اس لیے نہیں آیا کہ اسے ریشمی جُزدانوں میں لپیٹ کر طاق پر تبرُّک رکھا جائے یا جس طرح دوسری قومیں منتر پڑھا کرتی ہیں، ہم اسے طوطے کی طرح بغیر سمجھے پڑھ دیں۔ یہ کتاب انسانی زندگی کے متعلق اہم ترین حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔ اس کے نازل ہونے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے پڑھیں اور ان حقائق کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں اور اس کے لیے رائج الوقت زبانوں میں اس کا ترجمہ ضروری ہے۔ چنانچہ آہستہ آہستہ معترضین کی مخالفت کم ہوئی اور نہ صرف شاہ صاحب کے ترجمے نے رواج پایا، بلکہ اُردو اور دوسری زبانوں کے ترجموں کی راہ پیدا ہوگئی۔

قرآن مجید کا محض ترجمہ کر دینا ہی اس قدر اہم کام تھا کہ اگر شاہ صاحب فقط اسی کارِ خیر پر اکتفا کرتے اور وہ ابتدائی دُشواریاں دُور کر دیتے جو عام عُلَماء کی فرض ناشناسی اور کورانہ تقلید کی وجہ سے ان کے راستے میں حائل تھیں، تب بھی اسلامی تاریخ میں ان کا نام درخشاں ستارے کی طرح چمکتا، لیکن ان کا ترجمہ بطورِ خود بلند پایہ اور قابلِ قدر و عظمت ہے۔ ترجمے کی مخالفت بیشتر تو تقلید اور اُمورِ مذہب میں مغز کو چھوڑ کر اُستخوان کے پیچھے دوڑنے کی وجہ سے تھی، لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید کے ترجمے میں ہزاروں دِقّتیں ہیں۔ ترجمے میں لفظی صحت کو برقرار رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن کے بلیغ معانی اور اُس کی اَدَبی شان کو اس پر قربان نہ ہونے دینا اس قدر مشکل ہے کہ آج، جبکہ ہمیں قرآن مجید کے ترجموں میں دو سو سال کی مشق ہے اور قوم کے بہترین عُلما و اُدبا نے اس قومی خدمت پر توجُّہ کی ہے۔ ایک

بھی ترجمہ ایسا نہیں، جسے تسلّی بخش کہا جا سکے یا جس سے اصل کے زور بیان، فصاحت و بلاغت اور رُوحانی عظمت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ شاہ ولی اللہؒ کے ترجمے کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے بہتر ترجمہ نہیں ہو سکتا اور اصل میں ضرورت یہ ہے کہ مستند اور بلند پایہ ترجمے کے لیے علما اور اہلِ قلم کی ایک پُوری جماعت یہ فرض ادا کرے، لیکن اکثر باتوں میں وہ موجودہ اردو ترجموں سے کہیں بہتر ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے والے میں جن خصوصیتوں کی ضرورت ہے، وہ شاہ صاحب سے بڑھ کر آج تک کسی مترجم میں جمع نہیں ہوئیں۔ مولانا نذیر احمد کہتے ہیں۔ "فی الحقیقت قرآن کے مترجم ہونے کے لیے جتنی باتیں درکار تھیں، ترجمے سے ثابت ہوتا ہے وہ سب مولانا شاہ ولی اللہؒ میں علیٰ وجہ الکمال پائی جاتی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مولانا صاحبؒ کی نظر تفاسیر اور احادیث اور دین کی کتابوں پر ایسی وسیع ہے کہ بس انہیں کا حصّہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک آیت بلکہ ہر ایک لفظ کی نسبت مفسّرین کے جتنے اقوال ہیں وہ سب ان کے پیشِ نظر ہیں اور وہ ان میں جس کو واضح پاتے ہیں اُسے اختیار کرتے ہیں۔"

شاہ صاحبؒ نے نہ صرف قرآن مجید کا ترجمہ کیا، بلکہ اس مسئلے کے علمی پہلوؤں پر بھی ایک رسالہ لکھا اور مقدّمہ فی ترجمۃ القرآن مجید میں قرآن مجید کے مترجموں کی رہنمائی کے لیے کارآمد ہدایتیں درج کیں۔

شاہ صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں "اس بندۂ ضعیف پر خداوند تعالیٰ کی کئی بے شمار نعمتیں ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ عظیم الشّان نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھ کو قرآن مجید سمجھنے کی توفیق عطا فرمائی اور حضرت رسالت مآب کے احسانات اس کمترین اُمّت پر بہت ہیں، جن میں سب سے بڑا احسان قرآن مجید کی تبلیغ ہے۔"

قرآن مجید کی تبلیغ شاہ صاحب نے فقط ترجمہ کر کے ہی نہیں کی، بلکہ علمِ تفسیر کے متعلق کتابیں بھی لکھیں۔ جن میں الفوز الکبیر فی اُصُول التفسیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس کتاب کے چار باب ہیں، جن میں عُلُومِ قرآنی اور مطالعۂ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے۔ دوسرے باب میں آپ نے مسئلۂ نسخ پر مجتہدانہ انداز سے نظر

ڈالی ہے اور وہ آیاتِ منسوخہ جن کی تعداد بعض لوگوں کے نزدیک پانچ سَو کے قریب تھی اور جن کی تعداد علّامہ جلال الدّین سُیوطیؒ نے بھی بیس۲۰ مقرّر کی تھی چار سے زیادہ تسلیم نہیں کیں۔

فوز الکبیر کے بعض اندراجات سے خیال ہوتا ہے کہ شاہ صاحب قرآنی ارشادات کو وسیع سے وسیع مفہوم دینا چاہتے تھے۔ وہ مختلف آیتوں اور سورتوں کے متعلق اسبابِ نُزول کا خیال رکھتے ہیں، لیکن اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے کلامِ مجید کے اصلی مقصد پر پردہ نہ پڑ جائے۔ چنانچہ باب اوّل میں لکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

"عام مفسّرین نے ہر ایک آیت کو خواہ مباحثہ کی ہو یا احکام کی، ایک قصّے کے ساتھ ربط دیا ہے اور اس قصّے کو اس آیت کے لیے سببِ نزول مانا ہے لیکن حق یہ ہے کہ نُزُولِ قرآنی سے مقصودِ اصلی نفوسِ بشریّہ کی تہذیب اور اُن کے باطل عقاید اور فاسد اعمال کی تردید ہے۔ اِس لیے آیاتِ مناظرہ کے نُزُول کے لیے متکلّمین میں عقاید باطلہ کا وُجود اور آیاتِ احکام کے لیے ان میں اعمالِ فاسدہ اور مظالم کا شیوع اور آیاتِ تذکیر کے نُزول کے لیے ان کا بغیر ذکر اللہ واللہ وایّام اللہ اور موت و واقعات بعد الموت کے بیدار نہ ہونا، اصلی سبب ہُوا۔ خاص واقعات کو جن کے بیان کرنے کی زحمت اٹھائی گئی ہے اسبابِ نزول میں چنداں دخل نہیں۔ مگر سوائے چند آیات کے جن میں کسی ایسے واقعہ کی جانب اشارہ ہے جو رسول اللہ کے زمانے میں یا اس سے پیشتر واقع ہُوا ہو"

فوز الکبیر کی دوسری خصوصیّت شاہ صاحب کی انصاف پسندی اور اخلاقی جرأت ہے۔ مثلاً عام طور پر مسلمان زمانۂ جاہلیّت کے عربوں سے فقط برائیاں اور عیب ہی منسوب کرتے ہیں، لیکن شاہ صاحب نے اس معاملے میں بھی "انصاف بالائے طاعت" کے اُصول کو ملحوظ رکھا اور تصویر کے دونوں پہلو پیش کیے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی اصل مذہبی کتاب کو بدل ڈالا ہے، لیکن شاہ ولی اللہؒ اس کے قائل نہ تھے۔ وہ لکھتے ہیں "یہودی تحریفِ لفظی، تورات کے ترجمے

وغیرہ میں کیا کرتے تھے نہ کہ اصل کتاب میں کیونکہ فقیر کے نزدیک ایسا ہی محقق ہُوا ہے اور ابنِ عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔"

بعض مفسّرین نے اہلِ کتاب سے قصّے لے کر انھیں قرآنی تفاسیر اور عُلومِ اسلامی کا جزو بنا دیا ہے۔ اس کے خلاف شاہ صاحب نے جا بجا آواز بُلند کی ہے مثلاً فوز الکبیر میں لکھا ہے "یہاں پر یہ جان لینا مناسب ہے کہ حضرات انبیاءِ سابقین کے قصّے احادیث میں کم مذکور ہیں اور ان کے وہ لمبے چوڑے تذکرے جن کے بیان کرنے کی تکلیف عام مفسّرین بیان کرتے ہیں وہ سب اِلّا مَا شَآءَ اللّٰہُ علماءِ اہلِ کتاب سے منقول ہیں۔" اسی کتاب میں آگے چل کر پھر لکھتے ہیں "اسرائیلی روایات کا نقل کرنا ایک ایسی بلا ہے جو ہمارے دین میں داخل ہو گئی ہے۔ حالانکہ صحیح اُصُول یہ ہے کہ اُن کی نہ تصدیق کرو نہ تکذیب۔" مفسّرین کے بعض قصّے جنھیں عوام اسلام کا ضروری جُزو سمجھنے لگ گئے ہیں، شاہ صاحب کو بہت ناپسند تھے۔ فرماتے تھے "اور محمد بن اسحٰق واقدی کلبی نے قصّہ آفرینی میں جس قدر افراط کی ہے (یعنی وہ ہر ایک آیت کے تحت میں ایک قصّہ لائے ہیں) محدّثین کے نزدیک اُن کا اکثر حصّہ صحیح نہیں اور ان کے اسناد میں خامیاں ہیں۔ ان لوگوں کی اس افراط کو علمِ تفسیر کے لیے شرط سمجھنا صریح غلطی اور اس کے حفظ پر فہمِ کتابُ اللہ کو موقوف کرنا دراصل کتابُ اللہ سے اپنا حصّہ کھونا ہے۔"

مفسّرین کی یہی ژولیدہ نویسی تھی جس کی وجہ سے شاہ صاحب نے اپنے وصیّت نامے میں بھی لکھا کہ قرآن اور اس کا ترجمہ تفسیر کے بغیر ختم کرنا چاہیے۔ اور پھر اس کے بعد تفسیر، اور وہ بھی تفسیرِ جلالین (بقدرِ درس) پڑھائی جائے۔ (جو نہایت مختصر ہے اور جس کے الفاظ قرآن کے الفاظ جتنے ہیں) وہ لکھتے ہیں "قرآنِ عظیم اس طرح پڑھاویں کہ صرف قرآن اور ترجمہ بغیر تفسیر کے پڑھا جائے مگر جہاں شانِ نُزُول یا قاعدۂ نحو مشکل ہو وہاں ٹھہر جائیں اور بحث کریں بعد اس کے تفسیرِ جلالین بقدرِ درس پڑھاویں۔" (ترجمہ)

●●●●●●●●●●●●●●●

دعوت رجوع الی القرآن کی اساسی دستاویز

ڈاکٹر اسرار احمد

کی انقلاب آفریں تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

جس نے خواص و عوام اور علماء کرام اور دانشور حضرات سب سے یکساں خراج تحسین حاصل کیا۔ اور جس کے اردو میں چھ اور انگریزی میں تین ایڈیشنوں کے علاوہ عربی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے اور فارسی ترجمہ زیر طبع ہے۔

اسے زیادہ سے زیادہ وسیع حلقے میں پہنچا کر
تحریک رجوع الی القرآن میں حصہ لیجئے!

نوٹ: ڈاکٹر صاحب کی جملہ تالیفات کی طرح اس کتابچے کے حقوق اشاعت بھی محفوظ نہیں ہیں: جو صاحب چاہیں اسے اپنے طور پر طبع کرا کے خواہ قیمتاً فروخت کریں۔ خواہ مفت تقسیم کریں۔

ہدیہ

اردو: اعلیٰ -/۴، ادنیٰ -/۳ - انگریزی -/۵، عربی -/۴

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶ - کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور (فون: ۸۵۲۶۱۱)

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاهور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان —— اور —— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے —— اور —— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ —— اور —— غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ